

J.C. Sharma

12/9/57

جملہ حقوق محفوظ

بار سوم

قیمت دو روپے آٹھ آنے

پبلشر 'نذیر چودھری' نیا ادارہ، لاہور

پرنٹر 'ہی کو پریس' کپٹن پر سنگ پریس، لاہور

فہرس

۵	دیباچہ
۲۳	جہلم میں ناؤ پر
۳۷	انڈھا چھتری
۵۵	مجھے کتے نے کھا
۵۹	تالاب کی حسینہ
۷۹	آنگلی
۱۰۳	صرف ایک آنہ

۱۰۷	لاہور سے بہرام گلہ تاک
۱۳۱	ہامتا
۱۳۹	قبر
۱۵۳	گوماں
۱۶۷	مستور کی محبت
۱۸۵	یرقان

دیباچہ

از

پروفیسر سید فیاض محمود ایم۔ اے

کہانیاں کہنے اور سننے کا شوق انسان کے دل میں ہزار ہا سال سے موجود ہے۔ اول
اول تو یہ کہانیاں شاید سچے واقعات پر مبنی ہوں گی مگر انہیں بیان کرتے وقت ادبی ضرورت
کہیں نہ کہیں کہانی کے کسی نہ کسی پہلو کو اپنی مرضی کے مطابق یا کوئی خاص اثر پیدا کرنے کی غرض
سے بڑھا چڑھا کے بیان کر دیتا ہو گا۔ اگر یہ واقعہ کسی سردار کی طرح میں ہوتا تو شاید واقعات
کو اور بچا دے کر اور ان میں اضافہ کر کے اپنے ممدوح کو خوش کرنے کیلئے وہ مبالغہ اور اپنی توجہ
اختراع سے بھی کام لے لیتا ہو گا۔ بعد میں فرضی بہادر دل عاشقوں اور شکا ر یوں کے قصے
بھی لوگوں نے تراشے شروع کر دیے ہوں گے۔ ایسی کہانیاں ہر قوم کے پرانے ادبیات
میں پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر ایسے قصے ان کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان کہانیوں کا
منقصد انسانی زندگی کے کسی پہلو پر اخلاقی روشنی ڈالنا ہوتا ہے۔

مگر ان قدیم کہانیوں میں جس چیز پر زور دیا جاتا ہے۔ وہ ان کے افراد کی غیر معمولی
قوتیں ہیں۔ کہیں کسی شخص کے صبر کی تعریف ہوتی ہے تو کہیں اس کی بہادری کی کہیں

اس کی نیکی کی اور کہیں اس کی حیرت انگیز مستقل مزاجی کی۔ عام طور پر ان افراد کو کسی
 کسی صورت میں غلطی بدولتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے خالق العادت انسان اور
 غیر معمولی واقعات سے فقط ہمیں عالم غیب اور خدا کے قُدوس کی جبروت اور اس کے
 انسان پر جو احسانات ہیں۔ ان کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ان سے
 لوگ اچھے سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں اور سنا ہے کہ عبرت بھی پکڑ لیتے ہیں۔

ایسی کہانیاں کسی خاص اصول کے ماتحت وضع نہیں کی جاتی تھیں۔ عام طور پر
 ان میں مختصر اگر کسی آدمی یا عورت کی ساری زندگی کے حالات ہی بیان کر دیئے جاتے تھے
 رفتہ رفتہ لوگ محسوس کرتے گئے کہ اس اختصار سے کسی شخص کی زندگی کے چیدہ چیدہ
 واقعات کا تذکرہ ہو گیا مگر اس سے اس شخص کی ذہنی حالت، دلی کیفیت اور معاشرتی
 زندگی کے حال سے کچھ زیادہ آگاہی نہیں ہوئی۔ اس لئے لمبی لمبی داستانیں، رومانیں
 اور بعد میں ناول لکھے جانے لگے۔ جن میں آدمی کی پیدائش سے لیکر اس کی شادی تک
 یا پھر موت تک کے حالات بیان کئے جاتے۔ جیسے جیسے لوگ زیادہ خود شناس
 ہوتے گئے۔ ویسے ویسے وہ ناول لکھنے کے اصول بھی وضع کرتے گئے۔ چنانچہ
 مصنفین اپنے ناول ان اصولوں پر پورے اتارنے کی کوشش میں کافی ذہنی کاوش خرچ
 کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ ان ضوابط میں بھی تبدیلی ہوتی گئی اور ہر نئے مفکر رنارولسٹن
 اپنی خاص طرز نکال لی۔ کوئی زندگی کے کسی ایک پہلو پر زور دیتا تو دوسرا کسی اور نگاہ سے
 لکھتا۔ بعض تو محض اپنی کہانی کی ساخت یعنی پلاٹ پر زور دیتے اور بعض کردار نگاری پر

بعض ماحول اور طریقہ بود و ماند پر تو بعض معاشرت اور کسی خاص تمدن کی تصویر کشی پر۔ بعض کسی زمانہ کا نقشہ کھینچتے تو بعض کسی قوم یا ملک کی ذہنیت کا تجزیہ کرتے اور آج کل کے زمانہ میں تو مغرب میں ایسے ناول بھی لکھے جانے لگے ہیں جو محض خیالات کے ایک لامتناہی سلسلہ کی عکاسی کرتے ہیں اور انسان کے شعوری اور لا شعوری جذبات کی تحلیل کو اپنا مطمح نظر بناتے ہیں۔ غرض وہاں ناولوں کی بھی کئی ایک قسمیں ہیں اور اس فن کے ہزار پانکات۔

افسانہ نگاری جس سے ہم سب کی مراد مختصر افسانہ لکھنے سے ہے بحیثیت ایک علیحدہ صنف ادب کے انیسویں صدی کی اختراع ہے۔ اس سے پہلے مصنف کہانیاں لکھتے تھے مگر ان میں اور قدیم زمانہ کی کہانیوں میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ فنی لحاظ سے جسے ہم اب افسانہ کہتے ہیں۔ ایک علیحدہ چیز ہے۔ اس میں اور ناول میں بہت بڑا فرق ہے ظاہر میں تو ضخامت کا فرق ہی ان دونوں کو ایک دوسرے سے تمیز کرتا ہے مگر دراصل ان میں ایک ایسا بنیادی فرق ہے جس کی وضاحت سے کوئی تعلق نہیں مشہور عالم روسی افسانہ نگار چکیوف کے کئی ایک افسانے سو سو صفحوں سے زیادہ طویل ہیں مگر انہیں کسی صورت میں ناول نہیں کہا جاسکتا۔ ناول میں کسی ایک شخص پر دو یا تین یا دس یا پچاس اشخاص کی زندگی، ان کے ایک دوسرے سے تعلقات، میل جول، خیالات اور واقعات کا حال مفصل طریقہ سے لکھا جاسکتا ہے۔ ایک کنبہ چھوڑ کر ایک قبیلہ اور ایک قبیلہ سے قطع نظر ایک ملک کا حال چند مفروضہ اور نمایاں شخصیتوں کے تجربے اور ایک قبیلہ سے قطع نظر ایک ملک کا حال چند مفروضہ اور نمایاں شخصیتوں کے تجربے

زندگی کے ذریعہ سے ایک ناول میں بیان ہوتا ہے مگر افسانہ میں کسی ایک حادثہ، ایک واقعہ ایک پہلو، اور ایک جھلک کی تصویر سے زیادہ مضمون کی گنجائش نہیں کیجیے تاکہ اس میں سب سے مقدم چیز وحدت اثر ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی بات، کوئی لفظ، کوئی ایسا اشارہ اس میں موجود نہیں ہو سکتا جو لا تعلق اور بے ضرورت ہو یا جس سے افسانہ کی یک رنگی میں فرق چڑھ جائے۔ یا جس سے قاری کی توجہ مرکزی واقعہ یا کردار یا نکتہ سے ہٹ جائے چنانچہ ساخت کے لحاظ سے وہ افسانہ کامیاب ہوگا۔ جس میں کوئی غیر متعلق شے موجود نہ ہو۔ اگر افسانہ عملی ہے یعنی کسی خارجی واقعہ سے تعلق رکھتا ہے تو اس میں کوئی شاخ کوئی منشور ایسا نہیں نکلتا چاہئے جس کا افسانوی عمل اسے بلا واسطہ رشتہ نہ ہو اور اگر افسانہ کرداری ہے تو اس میں اس کردار یا ان کرداروں کے سوا جس کا اس افسانہ سے بدنی تعلق ہے کوئی بے ضرورت فرد نہیں شامل ہونا چاہئے۔ چھٹے افراد افسانہ میں داخل کئے گئے ہیں۔ انہیں فقط ایسی باتیں کرنی چاہئیں جن کا اس افسانہ سے بلا واسطہ تعلق ہو۔ دیگر حشو و زوائد سے افسانہ کو بالکل پاک ہونا چاہئے حتیٰ کہ اس کی زبان بھی ایسی صاف ہوئی اور صاف ہوئی چاہئے جو جذباتہ جاذب توجہ ہو۔ الفاظ کا انتخاب ایسا ہونا چاہئے جس سے کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اثر پیدا ہو سکے۔

شاید کوئی صاحب یہ سوال کہہ بیٹھیں کہ فنی لحاظ سے کس قسم کا افسانہ بہترین ہوتا ہے۔
 ————— المیہ طریب، مزاحیہ، رومانی، معاشرتی، تاریخی یا اخلاقی؟ اس کا جواب میں یہ دینگا کہ افسانہ وہ کامیاب ہے جس کی سچائی ایک آدمی یا ایک قوم یا ایک مذہب تک محدود
 حشو - زوائد

نہ ہو بلکہ جو فطرتِ انسانی کی صحیح ترین ترجمانی کرے مگر افسانہ کی نوعیت افسانہ نگار کی ہئیت سے تعلق رکھتی ہے۔ زندگی میں نعم، خوشی، مزاج، روحانیت، اچھیاکان سب کچھ موجود ہے یہ افسانہ نگار کی دماغی اور نفسیاتی ساخت پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کی بے پایاں دستوں سے کن واقعات کا انتخاب کرے۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس طرف مصنف کا رجحان ہو۔ اسے دنیا کا ہر واقعہ اسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض لوگ دنیا میں فقط رنج و الم ہی دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر محبت ناکام اور عاشق نامراد ہوتا ہے، بعض اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر مایوسی اور قنوطیت سے شدید نفرت کرتے ہیں اور ان کی نظریں ایسے مصنف فقط زندگی کا ایک رخ ہی پیش کرتے ہیں مثال کے طور پر ایک منظر کو سمجھتے۔ ایک تنگ و تاریک گلی ہے جس کے دونوں طرف کم حیثیت مکانوں کی قطاریں چلی جاتی ہیں۔ گلی کے درمیان ایک نالی ہے گلی کچی ہونے کے باعث عام طور پر کچرے سے بھری رہتی ہے۔ اس پر بھی چھوٹے لڑکے لڑکیاں گھروں کے باہر ادھر ادھر کھیلنے میں یا چھنے چلانے میں مصروف رہتے ہیں۔ لوگوں کی آمد و رفت بھی ہے۔ کھڑکیوں میں سے مروا عورت یا جوان لڑکے لڑکیاں نیچے یا سامنے جھانک بھی لیتے ہیں۔ لوگ نارخ ابال نہیں اب دیکھئے ایک روحانی افسانہ نگار ایسے منظر میں کیا دیکھتا ہے۔

”ایک جوان لڑکی کھڑکی میں کھڑی دھوپ میں اپنے بال سکھا رہی ہے۔ کبھی کپڑے سے انہیں اپنی نچھ لیتی ہے تو کبھی ہاتھوں سے انہیں جھٹک کہ کندھوں پر پھیر لیتی ہے بالوں سے ایک نور اس کی توجہ ہٹتی تو نیچے گلی میں کھلتے ہوئے بچوں کو ایک چلتی

نظر سے دیکھ لیتی ہے۔ مگر دراصل اس کی نظر ادھر ادھر سے بہت کر ایک سامنے کے مکان کی کھڑکی سے گزرتی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے نوجوان پر پڑتی ہے جو بظاہر کتاب پڑھنے میں مشغول ہے مگر جس کی توجہ تمام تر کتاب کے صفحات تک محدود نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک فطرت نگار اسی سے مندرجہ ذیل تاثرات اخذ کرتا ہے :-
 ”گلی کچھ زیادہ چوڑی نہیں اور اگرچہ دن کافی چمک رہا ہے مگر گلی میں ابھی تک تاریکی کے آثار موجود ہیں۔ لڑکے لڑکیاں جو ایک سوکھی جگہ دیکھ کر کھیلنے میں مشغول ہیں۔ زیادہ تر پتلے ڈبلے ہیں۔ ایک بوڑھی اور کبیری عورت ہاتھ میں لکڑی لئے آہستہ آہستہ چلی آ رہی ہے۔ اسے اس خشک جگہ سے گذرنا ہے۔ یہاں وہ لڑکے کھیل رہے ہیں مگر وہ اس کے لئے نہیں بیٹھے وہ چھڑی سے انہیں ہٹاتی ہے مگر ہر کوئی وہ ایک اپنی جگہ سے سرک کے پھر وہیں آکھڑا ہوتا ہے اور باوجودیکہ وہ بڑھیا اونچی آواز میں بڑبڑاتی ہے۔ وہ اس کی بات نہیں سنتے۔ اتنے میں ایک لڑکا کسی دوسرے کو دھکا دیتا ہے اور وہ دوسرا پیچھے جو ہٹتا ہے تو بڑھیا کی چھڑی والے ہاتھ سے آکر ٹکراتا ہے، چھڑی گر جاتی ہے اور اس کے ساتھ وہ بڑھیا بھی، سب پیچھے بڑھیا کو گرتے دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ بڑھیا بیچاری کے چوٹ آجاتی ہے اور اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔ بصد مشکل وہ اپنے آپ کو اٹھاتی ہے اور پھر اپنی چھڑی پکڑے آگے بڑھ جاتی ہے۔ جب وہ آگے نکل جاتی ہے تو لڑکے واپس آکر کھیلنے لگتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی

اس بڑھیا کے متعلق سوال نہیں کرتا۔ وغیرہ اور وغیرہ۔

اسی طرح ایک معاشرتی افسانہ لکھنے والا یہ واقعات دیکھتا ہے۔

ایک گھر سے خاوند کپڑے دپڑے پہن کر باہر کام پر جانے کو ہے کہ بیوی اس کے سامنے کھانا لاکے رکھتی ہے۔ اتفاق سے کھانے میں نمک زیادہ ہوتا ہے۔ میاں اعتراض کرتا ہے۔ بیوی مزاج کی تیز ہے۔ وہ جواب باصواب دیتی ہے۔ خاوند اور بھڑکتا ہے بیوی کہتی ہے تمہیں تو کچھ پسند ہی نہیں آتا۔ میاں کہتا ہے تمہیں تو کسی چیز کا سلیقہ ہی نہیں، بیوی کہتی ہے تمہیں تو بولنے کی عادت ہے، میاں کہتا ہے تم اپنی طرف تو دیکھو، غرض یہ کہ میاں روٹی ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے اس جگہ بھونک دیتا ہے۔ بیوی اور بھی تلملاتی ہے۔ میاں کھانا زہر مار کر کے جلد اٹھتا ہے، پانی بھی نہیں پیتا اور دروازہ زور سے بند کر کے باہر چلا جاتا ہے۔ اگر افسانہ کو اور زوردار بنانا ہو تو میاں کو ادا کھانا کھلائیے اور اُسے غصہ سے بھر ہوا کام پر بھیج دیجئے۔ خاوند کے جانے کے بعد ماں برتن اٹھاتی ہے کہ اتنے میں اُس کا چھوٹا بچہ جو اس دوران میں اس کی ٹانگوں سے چسپا ہوا تھا۔ اُس کی توجہ کسی اپنی بات کی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ وہ اُسے جھٹکا دے کر سجدہ کرتی ہے وہ گر پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے مگر وہ پروا نہیں کرتی وہ اور زیادہ چلاتا ہے مگر ماں اس پر خفا ہوتی ہے۔ وہ باز نہیں آتا تنگ آ کے وہ خاوند کا غصہ اس بے قصور پر نکالتی ہے اور اسے ایک چپت رسید کرتی ہے۔

ایسے ہی اسی گلی میں رہنے والوں کے متعلق آپ کئی پہلو سے اسانے وضع کر سکتے ہیں۔ اور وہ سب کے سب حقیقت پر مبنی ہوں گے مگر وہ نفسِ مضمحل میں، نقطہ نگاہ میں اور اثر میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں گے۔ یہ تو ایک گلی میں رہنے والے باشندوں کا حال ہے۔ آپ ایک ہی واقعہ کو لیجئے۔ سڑک پر ایک کیلے کا چھلکا پڑا ہے صبح کا وقت ہے۔ لڑکے لڑکیاں سکول جا رہے ہیں۔ ایک جوان لڑکی جو اپنے دھیان میں چلی جا رہی ہے۔ اس چھلکے پر قدم رکھتے ہی پھسل جاتی ہے اور سنبھل نہیں سکتی۔ وہ بھی اور اُس کی کتابیں بھی گر پڑتی ہیں۔ اُس کے ساتھ والیوں میں دو ایک سنسن دیتی ہیں اور ایک اُسے اٹھنے میں مدد دیتی ہے۔ اب اس واقعہ کو رومانی عینک لگا کر دیکھئے۔

”لڑکی ایک نازک بدنِ دو تیز ہے جس کی رنگت سُرخ و سفید ہے۔ آنکھیں سُرمی ہیں اور عام طور پر کبھی پلکوں سے چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ منگاب شرم سے بالکل ہی بند ہوئی جاتی ہیں جب وہ اپنی سہیلی کے سہارے کھڑی ہوتی ہیں اور کتابیں اکٹھی کر کے چلنے لگتی ہے تو اس کی نظر سامنے اٹھتی ہے اور اُسے ایک جوانِ شکیل اور خوش پوش طالب علم دکھائی دیتا ہے جو اُس کی طرف نہایت بہادری سے دیکھ رہا ہے جیسا ہے اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ طالب علم کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے مگر لڑکی پھر مڑ کے نہیں دیکھتی۔ وہ دن طالب علم کے لئے بہت اُداس اور پریشان کن ہوتا ہے۔ دوسرے دن وہ

اُسی وقت وہاں سے گزرتا ہے اور دُور دُور نظر ڈالتا ہے خوش قسمتی سے وہ لڑکی پھر اُسی وقت اپنی سہیلیوں سمیت وہاں سے گزرتی ہے کیونکہ اُس کے سکول کا راستہ ہی ہے اور آج بھی اُس کی نظریں اُس طالب علم سے دوچار ہوتی ہیں۔ اسی طرح روز دیکھنے سے اُنہیں ایک دوسرے کی شکل سے اُنس ہو جاتا ہے اور پھر وہ لڑکا اپنا کام چھوڑ کر لڑکیوں کے پیچھے پیچھے انہیں گھر چھوڑنے جاتا ہے و دیا تین نعتہ کے بعد چھٹی کے بعد بھی اسی طرح وہ ان کے پیچھے پیچھے انہیں گھر چھوڑنے جاتا ہے اور ایک دن جرأت کر کے جب وہ لڑکی اپنے گھر داخل ہونے لگتی ہے تو وہ اسے سلام بھی کر دیتا ہے۔ وہ اپنا سر جھکا دیتی ہے۔ اس طرح اشاروں اشاروں میں اُن کی محبت کا آغاز ہوتا ہے بعد میں آپ اُسے کوئی سازنگ دے دیجئے۔ لڑکے اور لڑکی کو ہندو بننے کے اُن کی کچھ مدت بعد شادی کر دیا جائے یا لڑکے کو مسلمان اور لڑکی کو ہندو تصور کر کے اُن کی محبت کو ناکام رہنے دیجئے یا اور جو کچھ آپ کی مرضی ہو کہیئے۔

کوئی اور افسانہ نگار شاید یہ لکھے۔

”لڑکی نے سننے کی بہت کوشش کی مگر گرنے سے نہ بچ سکی اور گری تو ایسی کہ اس کا ٹخنہ دوہرا ہو گیا اور پھر جو وہ اُٹھی تو اُس سے چلا نہ گیا۔ لڑکیوں کی ”مائی“ ساتھ تھی اور وہ ان کے بستے ایک ٹوکری میں رکھ کر سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کے ٹخنے میں مروج آگئی ہے تو اُس نے کہانی بی تم اب سکول کیا جاؤ گے گھر واپس چلی جاؤ۔ میں تمہیں تا نگہ کر ادیتی ہوں۔ لڑکی بیچاری غریب تھی۔ اس کے

پاس تانگے کا کرایہ کہاں تھا اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ گھر میں بھی روپے پیسے وافر نہیں
 مانا جی دل میں کڑھیں گی۔ اس لئے اُس نے کہا نہیں کچھ نہیں ہوا۔ میں سکول چلتی
 ہوں۔ راجکماری کا سہارا لے لیتی ہوں۔ چنانچہ وہ اپنی سہیلی کا سہارا لئے ہوئے درد
 کو دبائے بہت مشکل سے سکول پہنچی۔ وہاں جا کے دیکھا کہ ٹخنہ اتنے میں ہی بہت سُوج
 گیا ہے اور درد بھی اب بہت زیادہ ہونے لگ گیا ہے چنانچہ اُستانی نے اُسے جبراً
 گھر بھیجا۔ جب اس کی مانا جی نے اُسے دیکھا تو انہیں دوسری تکلیف ہوئی۔ ایک
 تو تانگے کا کرایہ پھر مرہم پٹی اور تیمار داری۔ ان کی اپنی صحت اچھی نہ تھی وغیرہ وغیرہ۔
 اسی طرح آپ اسی ایک چھوٹے سے واقعہ کو کئی ایک صورتوں میں پیش کر سکتے ہیں
 یہ فقط افسانہ نگار کی ذہنی کیفیت اور رجحان طبیعت پر منحصر ہے۔ اگر وہ آپ کو رُلانا
 چاہتا ہے اور اُس کا دل خود رقیق ہے تو وہ درد اور رنج کے معمولی سے واقعہ کو اس
 قدر بڑھا کے لکھے گا کہ آپ پڑھتے پڑھتے رو دیں گے مگر فنی لحاظ سے یہ ایک ناقابل
 معافی نقص ہے۔ افسانہ کی مختصر سی زمین میں ہمیں اس کفایت سے کام لینا ہوتا ہے
 کہ کہیں مبالغہ سے کام نہیں لیا جاسکتا اور اگر کوئی افسانہ نگار عقل کی پاسبانی سے
 تنگ آکر دل کو تنہا چھوڑ دے اور اپنے قارئین کو دل بھوکے رلائے تو یہ اس کا اپنا
 قصور ہے اس کا افسانہ اس جیسے رقیق القلب حضرات کو پسند آ جائے تو
 آجائے۔ فنی اعتبار سے وہ افسانہ بہت گھٹیا ہو گا۔ کیونکہ ادب میں درد و رنج اور اُل
 کے جذبات سے ہم کام ضرور لے سکتے ہیں مگر اتنا ہی جتنے کی ہمیں اپنے تجربہ حیات کے

پیش کرنے میں ضرورت ہو یا جتنا دروز زندگی کے مختلف عناصر میں مناسب طور پر موجود ہو۔ ہمارے ہاں جذبات نگاری اور جذباتیت میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ عام افسانہ نگار نہ کسی جذبہ عظیم کے قابل ہوتے ہیں اور نہ اس کے متحمل اس لئے وہ اکثر رکیک اور عامیانه جذبات کو ہی اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ لوگ ان سے بہت متاثر ہو جاتے ہیں، انہیں نہ ادبی صنعتوں سے کام ہوتا ہے اور نہ نزاکت بیان سے غرض وہ جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر اس جذبہ کے ادا کرنے میں صرف نہیں کر دیتے انہیں چین نہیں آتا۔ حالانکہ اکثر مختصر الفاظ میں آپ گہرے سے گہرے جذبہ کو اس طریق پر ادا کر سکتے ہیں کہ اس کا دو صفحوں تک پھیلے ہوئے بیان سے قاری پر زیادہ اثر ہو۔

میں نے اس دیا چہ میں افسانہ نگاری کے ان دو ایک پہلوؤں پر اسلئے رائے زنی کی ہے کہ ہمارے دوست کہشن چندر صاحب کے افسانوں کو ان اصولوں کی روشنی میں پرکھا جائے۔ کہشن چندر صاحب فطرتاً روحانی واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ زمانہ کے سماجی اقتصادی مسائل سے بے خبر بھی نہیں جیسا کہ ان کے افسانہ صرف ایک آنہ اور مجھے کہنے کا ٹاٹا اور قبر سے ظاہر ہے مگر ان کی فطری شعریّت اور کشمیر کی پہاڑیوں سے ان کی روحانی نسبت انہیں روحانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ مثلاً ان کے پہلے افسانہ ”بہلم میں ناؤ پر“ کو لیجئے اس میں جو چیز دلکش ہے۔ وہ ان کا بد صورت عورت کا کردار ہے۔ جنہیں وہ سرسری طور پر بیان کر سکتے ہیں۔ اس بد صورت عورت میں زندگی ہے

وہ ان کی "بیمار کلی" میں نہیں میرا خیال ہے کہ اگر وہ واقعیت پرست ہوتے تو اس بڑے عورت کے کردار کی طرف زیادہ توجہ دیتے مگر انہیں وہ نوجوان کالج کی طالبہ علم زیادہ قابل توجہ معلوم ہوئی۔

ان کی روحانیت ان کے انسانہ صرف ایک آنہ جو ایک اقتصادی قسم کا افسانہ ہے جس میں کچی نہیں رہتی سرورش اسٹیشن کے ویمنگ روم میں رات بسر کرتا ہے تو ایک بھکارن اسے کھانا کھلاتی ہے اور اس مردت کے باوجود صبح کو وہاں سے چل دیتی ہے اور سرورش سے شکریہ کی طالب نہیں ہوتی "گو ماں" میں جب پنڈت جی کو تھانیدا نگہ نثار کر کے لئے جا رہا ہے تو گو ماں ایک روپوں سے بھری ہوئی جینیلی لئے ہوئے آتی ہے اور رادی سے کہتی ہے "بھائی... مہیے بھائی کو چھڑا دو" مصنف نے اس سے پہلے ہمیں گو ماں کے کردار کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ سوائے اس کے کہ جب پنڈت جی نے اُس پر دست درازی شروع کی تو اُس نے اُن کا منہ نوچ لیا تھا۔ اب گو ماں اُپلے لے کے آتی ہے تو پنڈت جی کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور آگے بڑھ کے ٹوہ کو متی کے پاؤں چھو لیتے ہیں اور ناک بھجے میں بولتے ہیں "بس بہن تمہارے روپے مجھے پہنچ گئے" میں قید سے آزاد ہو گیا۔ ایسی باتیں اور یہ جذباتی فضا ہم کہ سن چند صاحب کی رومان الگیز دنیا میں بحشرت پاتے ہیں "مستوی کی محبت" ایک خالص رومانی چیز ہے اور ایک کامیاب چیز ہے اس میں انہوں نے نہ مبالغہ سے اور نہ کسی جذباتی اسراف سے کام لیا ہے۔ شام سند کی شخصیت اس کے خطوط سے نمایاں طور پر

فصول فرنی

واضح ہوتی ہے اور گنتی سے اس کی دلچسپی جس تبدیریج طریقہ پر ترقی پکڑتی ہے وہ انہوں نے بہت سچائی سے بیان کی ہے اور پھر اس کہانی کا انجام موزوں اور پراثر ہے

مگر یہ کہنا کہ وہ مدعاں نگاری ہیں اُغیبت کو نظر انداز کر دیتے ہیں صحیح نہ ہوگا۔ ان کے افسانہ "قبر" میں کنہیا لال کے چھ بڑے بھائیوں کا رکتن سے جو سلوک ہے اُسے انہوں نے بہت احسن طریقہ سے بیان کیا ہے۔ مثلاً ذیل کی چند ایک سطور ملاحظہ ہوں :-

"انسانی ہمدردی کے اس شدید مظاہرے کی وقت مبری بھابیوں کی صورتیں دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں یا پھر کبھی یوں ہوتا ہے کہ رکتن ہمارے گھر اُداس اور غمگین صورت بنائے آئی اور پہلا بھائی کیا بات ہے رکتن؟ دوسرا بھائی رکتن کیوں کیا بات ہے؟ تیسرا بھائی رکتن اُداس کیوں ہو؟ چوتھا بھائی کیا کسی نے تجھے کچھ کہا ہے؟ پانچویں بھائی کی باری آنے سے پہلے ہی رکتن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سکریوں کے درمیان کہتی جاتی چپالے ماں کو آج پھر سپیٹ ڈالا چپالے ... بچپانے ... ہوں ... ہوں ... پانچویں بھائی نے گرج کر کہا: چپالے مارا ... کیوں ... اسے کیا حق ہے تمہاری ماں کو سپٹنے کا؟ وہ کہاں سے آیا سالہا عرصہ شہداء کیوں جی؟ میں پوچھتا ہوں اسے تمہاری ماں کو سپٹنے کا کیا حق ہے؟ وغیرہ

ان چھٹوں بھائیوں کا کردار ایک دوسرے سے مختلف نہیں اور نہ ہی مصنف کو ان کی طرف علیحدہ علیحدہ توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ ان سب کی باتوں سے مجموعی طور پر ایک خاص اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی ہوس کو کنہیا لال کی فونیز اور جوان محبت کی ضد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ اثر پورے طور پر پیدا ہو جاتا ہے اور جو طنز کہانی کے اس حصہ

میں نہیں ہے۔ وہ اس کی واقعیت کو اور بھی دو بالا کر دیتی ہے

”اندھے چھترتی“ میں یہاں چھترتی کی مکھنی سے محبت و احسانیت کی خوشبو سے لبریز ہے
وہیں اس میں واقعیت گریز نہیں کیا گیا۔ مثلاً جب چھترتی واپس دیس میں آتا ہے تو جس طرح
سب لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے اور جس طرح بڑی بوڑھیاں اس کے چاؤ ملہا کر کتی ہیں وہ
قابل تعریف ہے اور جس طرح سب لوگ اس کے سامان کو اس سے بھرتے ہیں۔ وہ بھی
حقیقت سے دور نہیں۔

بلکہ کرشن چندر تو واقعیت نگاری کرتے وقت زندگی کے بعض گھٹاؤں پر تجربات کے
استعمال سے بھی پرہیز نہیں کرتے مجھے کتے نے کھانا“ میں غریب کسان اور اس کی بیوی سے جو تڑاؤ تہنا
ہے وہ ان کو نظر میں کھب ماتا ہے اور ایسے ہی صرف ایک آنہ میں سروش کی بیچارگی اور لوگوں کی
بے اعتنائی بھوک اور افلاس اور بیزگاری کے جو دردناک مناظر کرشن چندر پیش کرتے ہیں۔ وہ اس
امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کے بدنما اور تکلیف دہ پہلو بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں
وہ فقط رنگین خواب ہی نہیں دیکھتے۔ ان کی دنیا میں توس و فخر کی سی دلا دیز فضا میں ہی نہیں
موجود ہوتی ہیں۔ وہ کنہیا لال کی شادی، اس کے بٹیمار بچے اور اس کی محنت اور بیماری اور انبالی
موت کو بھی اپنی دنیا میں جگہ دیتے ہیں۔

مگر و احسانیت ان کی طبیعت پر اس قدر حاوی ہے کہ لاہور سے بہارم گلہ ناک میں جب وہ
لوری چھپم کے آبشار کو دیکھ کر واپس آ رہے ہیں تو انہیں ایک غمیدہ کمزور اور ناتواں بڑھیا ملتی ہے جو ان
بیمیک مانگتی ہے جو چیز کرشن چندر صاحب کو اس بڑھیا کے متعلق قابل غور اور تعجب معلوم رہی

ہے۔ وہ اس کا نام ہے اور نام اس کا جیسا کہ وہاں کی عورتوں کا ہوتا ہے ہے "نور جہاں" ہے اور یہ کہ چاندنی میں اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔

کرشن چندر صاحب کے افسانوں میں جو تین ظرافت جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ وہ ان کے طرزِ دنیا میں اور بھی دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ظرافت جہاں کہیں بھی موجود ہے مبیاحتہ اور تہ تکلف سے وہ مجھے کہتے نے کاٹائیں ہر خواہ لاہور سے بہرام گلہ نگار میں یا یرقان "اے ان کی ظرافت کی سرمد ہم ہے گشتہ اور بعض دفعہ اس مسکراہٹ سے مشابہ ہوتی ہے جو آنکھوں میں آنکھوں میں رہے اور جس سے سولے لبوں کی ایک خفیف سی جنبش کے چہرے کے نقش میں اور کئی حرکت پیدا ہو مثلاً مجھے کہتے نے کاٹا" میں لکھتے ہیں: "میں نے اکثر شریف اجنبیوں کو مسکرا مسکرا کر اپنے اپنے باتیں کرتے سنا ہے یا چھپڑی کو اس طرح زرد زور سے تہدید کی انداز میں ہلاتے ہوئے دیکھا ہے گویا کسی غیبی دشمن کے حملوں کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اس وقت ان کے لب سے اتنی درشتی اور بربریت کا اظہار ہوتا ہے کہ چوک میں کھڑا ہوا پولیس کا سپاہی بھی مشتبه نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر دل میں سوچتا ہے کہ کہیں یہ وہی پاگل خانہ سے بھاگا ہوا سوداگر تو نہیں جس کا حلیہ میری ڈائری میں محفوظ ہے۔" اب اگر آپ اس عبارت کا تجزیہ کریں تو آپ کو اس میں کوئی جملہ بذاتہ ظریفانہ نظر نہیں آئیگا۔ مگر آپ ساری عبارت کے پڑھنے سے اپنے دماغ میں ایک ہلکا سا مسرت کا جھوکا محسوس کریں گے۔ ان کا مذاق ہمیشہ مہذب اور میسر رہتا ہے۔ لاہور سے بہرام گلہ نگار میں دو ایک دفعہ بہت پر لطف گفتگو لکھتے ہیں خصوصیت سے قربان علی اور چوکی کے حسین خاں کے درمیان جو چوچیں ہوتی ہیں ان میں ظریفانہ رنگ کافی گاڑھا ہوتا ہے۔

ان کے افسانہ "پرتان" میں ان تینوں خصوصیات کی آمیزش ہے اور یہ افسانہ میری نظر میں ان کا بہترین افسانہ ہے طرافت اسکے جملہ جملہ سے مترشح ہے میند سجدہ ذیل سطور ملاحظہ ہوں "ہمارا قصیدہ بہت چھوٹا ہے اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم نین ڈاکٹر اور دو دیوید پکٹس کرتے ہیں سڈو اڈا کی صرف ایک مکان ہے۔ ملائی کی برف بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں اور وہ ایک نوجوان ہے اور مچلا اور شاما کا چاہنے والا۔ شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برف مفت کھا جاتی ہے۔ صرف دو درزی ہیں۔ ایک بچاڑ ہے سیدھا سادا آدمی وہ قمیص کی سلائی دو آنے تک قبول کر لیتا ہے۔ دوسرا دلہنڈی پاس ہے اُس نے تین سال میں راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف انگریزی ٹیلرنگ شاپ میں کام سیکھا ہے۔ وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے جتنی کپڑے کی قیمت بہانے قصے کے نوجوان اس سے بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں اس کے بعد کے پیراگراف بھی بہت دلچسپ ادنی لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ اُن سے بڑھ کر اس قصہ کی زندگی اور شاما اور اس کے چاہنے والوں کا پس منظر قائم ہو جاتا ہے بلکہ اس سے گویا ہماری تہذیب اور تمدن تک کی عکاسی ہوتی ہے اور یہی افسانہ نگاری کا کمال ہے کہ افسانہ واقعیت ہی کی ترجمانی نہ کرے بلکہ زندگی کی مکمل تصویر کی جھلک اس سے آشکار ہو۔ اس سے لوگوں کی طرزِ بانئش کا پتہ ہی نہ چلے بلکہ وہ اک قوم کی ذہنیت اور اُس کے تمدن کی آئینہ داری بھی کرے۔ یہ چیز ان کے افسانے "پرتان" سے ہی نہیں بلکہ کسی حد تک "چھترتی"۔ "آنگلی" سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی چیزیں افسانہ نگاری کی معراج ہے۔

سب سے آخر میں ان کے طرزِ بیان اور قدرتِ زبان کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ سن چند

صاحب کی اردو بہت پاکیزہ ہے اور ان کی ترکیبوں میں جدت ہوتی ہے۔ ان کے جملے پر ہر کہ
 خیال اور بعض دفعہ حیرانی ہوتی ہے کہ یہ جملہ کس قدر موزوں اور گویا لازمی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے
 ہوتے ہیں مگر ان کے استعمال سے عبارت زندہ ہو جاتی ہے۔ "ہلیم میں ناؤ پر" میں لکھتے ہیں: "ایسا
 معلوم ہوتا تھا کہ نغمے کی ہر لہریں کسی ہجر حسینہ کی رنج کھینچی ہوئی چلی آرہی ہے یا دریا نے ہلیم
 کی وسیع چادر آب ایک صحرائے حسن میں بہا رہی کشتی ڈاچی بنی ہوئی محبوب کی تلاش میں جا رہی
 ہے۔" رٹھے ہوئے محبوب کو منانے کیلئے: "پھر میں نے سمجھایا غروب آفتاب نہیں المودہ سحر
 ہے۔ مغرب نہیں مشرق ہے۔" رشتی کا منبع اعظم ہے۔ "میں غیری فانی انسان ہیں جو اس کبھی
 غرق نہ ہونے والی کشتی پر سوار ہو کر اپنے محبوب سے ملنے جا رہے ہیں۔ اپنے ابدی محبوب سے۔"
 "تالاب کی حسینہ" کے آخر میں لکھتے ہیں: "تیرے تیرے میں نے سوچا کہ اس زندگی کے بے پایاں
 تالاب میں ہمیشہ یونہی ہزار ہیگا۔ یہاں سنہری کی لہریں ہیں اور موت کے چھینٹے بھی، لہریں اور چھینٹے
 نہ صوف مناسب ہی بلکہ اچھوتے بھی! ان کی تشبیہیں بھی عموماً بالکل نئی ہوتی ہیں ملاحظہ ہوں۔
 "ان آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی مگر پھر فوراً ہی گم ہو گئی جیسے کوئی حسینہ گریز
 سمندر کے گہرے پانیوں میں کھو جائے یا مکتی کے
 پانی کی ہلکی ٹوٹی ہوئی لہروں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کنڈیل کے لاکھوں پھول کھل گئے ہیں"
 آنگی میں اس لڑکی کے متعلق لکھتے ہیں: "اب اس کی چال مختلف ہے بازو اب بے پڑائی
 سے نہیں ہلے اور گزرنے ایک طرف کو جھک گئی ہے۔ اب اک نئی تصویر ہے۔ اک نیا مجسمہ ہے
 وہ جھلکی کی دیوی ختی تو یہ دوشیزہ سحر ہے۔ اس مجسمہ کی تراش فرالی ہے۔ اس تصویر کا رنگ نیا

اس گیت کی لئے انوکھی ہے۔ کاش میں معنی ہوتا۔ ایسی تحریر میں جو بیانتگی اور شعریت ہے وہ کہشن چندر کے طرزِ ادا کی جان ہے۔ اُن کا ایک ایک جملہ جو بظاہر سادہ مگر دراصل مطلب اور موزوں ہوتا ہے۔ دل میں گھر کر لیتا ہے۔ لکھتے ہیں ”بگی کو ہستانی گلاب کی ایک کلی ہے جیسا سے سٹی ہوئی اور پتوں سے چھپی ہوئی“ ان کی قوتِ مشاہدہ اور اسلوبِ بیان ہی اُن کے لئے شاعروں کی صف میں جگہ پیدا کر سکتا ہے۔

کہشن چندر صاحب ایک نوجوان افسانہ نگار ہیں اور اُن کی تحریریں، تخیل میں قوتِ تخلیق میں رعنائی اور تازگی موجود ہے۔ ان کا دل بہت حساس ہے اور وہ درد اور تکلیف کو برواشت نہیں کر سکتے۔ یہ امر ان کے افسانے ”صرف ایک آنہ“ اور دوسری کہانیوں سے بھی صاف ظاہر ہے۔ ان کی نظر ہر جگہ اور ان کا دماغ زندگی کے ہر پہلو تک پہنچتا ہے۔ وہ ایک دلچسپ شخصیت رکھتے ہیں اور ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ پنجابی ہیں اور اپنی دلکش کہانیوں میں ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں :

جہلم میں ناؤ پر

گائیڈ لائن تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا۔ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور نمازِ آفتاب اور بھی حدیں پیدا کر دیا تھا۔ میں درمیانے درجے میں بیٹھا ہوا تھا لاری والوں نے بھی ریلوے کی طرح مختلف درجے بنا دیئے ہیں اور اپنی قیمت کو کوس رہا تھا کہ کوئی موٹر نہ ملی۔ ورنہ راستہ آسانی سے طے ہو جاتا۔ یوں بھی تمام لاری میں بستی کا کوئی سامان نہ تھا میرے دائیں طرف مور کی طرح طرہ پھیلائے ہوئے ایک ننھا نیا صاحب تشریف فرما تھے جو بار بار مچھول کو تاؤ دیتے جاتے تھے۔ سب آگے آگے اول درجے کی نشست پر یعنی ڈرائیور کے بالکل قریب ایک تحصیلدار صاحب جلوہ افروز تھے جن کی خداں پیشانی اور دھیلے صاف سے ان کی دلی طمانیت کا اظہار ہوتا تھا۔ میرے سامنے کی نشست پر چار عورتیں بیٹھی تھیں، دو

بالکل بوڑھی اور دوادھیر عمر کی نہیں مگر جو عورت میرے بالکل مقابل بیٹھی تھی اور جو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لئے تھی وہ باقی عورتوں سے کم عمر اور زیادہ بد صورت تھی۔ وہ کبھی کبھی گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس دنیا میں ہر کوئی ایک حسین کی تلاش میں ہے۔ یہ تو میں واثق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں میں پرچ گیا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا میں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور لاری کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر آہ اس مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں جو اپنی زندگی کی منزل پر بے تحاشا بھاگی جا رہی تھی۔ مجھے کہیں بھی رومان نظر نہ آیا، دل بڑا شستہ چہرے تھے اور حقے یا پھر تھانیدار صاحب کا موچل۔ میں نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں کہا کہ اس لاری میں سب کچھ ہے مگر حسن ناپید ہے، دوسرے لمحہ میں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کم عمر بد صورت عورت اپنے چھوٹے سپر پر جھکی ہوئی اسے نہایت مدھم آواز میں میری گود میں چلے جانے کو کہہ رہی تھی۔

اُس نے اپنی سانولی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھ کر گھٹے ہوئے لہجہ میں کہا "آہ میں کس قدر تھک گئی ہوں، میرا سانس گھٹا جاتا ہے۔"

بیجاری غریب عورت! میرا مطلب یہ ہے کہ گودہ ریشم میں ملبوس تھی اور بے حد بد صورت تھی۔ پھر بھی عورت فطرًا غریب اور کمزور ہوتی ہے، چنانچہ میں نے چھوٹے بچے کو اپنی رانوں پر سے لیا۔

عورت نے احسان مند لگا ہوں سے میری طرف دیکھا، پھر کھڑکی سے سر باہر لگا کرتے کرتے لگی

عشق کی مجبوریاں، ناچاریاں، میں نے جلدی سے ننھے کو تھانیدار صاحب کی
آنکھوں میں دھکیل دیا اور خود اٹھ کر ڈرائیور کو لاری ٹھہرانے کے لئے کہا۔

ڈرائیور بولا "سرکار یہاں لاری ٹھہرانے سے کیا فائدہ، بس گاٹیا لیاں کا گھاٹ کوئی پون
میل رہ گیا ہے، وہیں ٹھہراؤں گا، کسٹم کی چوکی پر، دریا کے کنارے، دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
سے ان کی طبیعت راس ہو جائے گی۔

چنانچہ یہی ہوا۔

گاٹیا لیاں اور شہر جہلم کے درمیان دریا سے جہلم بہتا ہے۔ اس لئے شہر جہلم کو جانے کیلئے
گاٹیا لیاں کی چونگی پر عموماً ہر وقت بھیڑ سی لگی رہتی ہے۔ ریاست جموں کو جاتے ہوئے مسافرو
کا تانتا، ریاست جموں سے جہلم آئے ہوئے لوگ، اسباب سے لدے ہوئے بیل یا گدھے، بچوں
پر ٹھہری ہوئی بے شمار لاریاں اور دریا کے کنارے بندھے ہوئے لمبے لمبے مچھیرے، ایک چھوٹی
سی بندرگاہ کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اسی بھیڑ بھاڑ میں نے تھانیدار صاحب تحصیلدار صاحب
اور کم عمر بد صورت کو بھی کھو دیا۔ میرا اسباب مختصر سا تھا۔ اس لئے چونگی والوں سے جلد خلاصی
کرائی اور ایک چھوٹے سے قلی پر اسباب لا کر میں دریا کی سمت چلا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ گاٹیا لیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا۔ سر میں درد بھی پیدا
ہو گیا تھا۔ لیکن اب جوں جوں دریا کے وسیع پانیوں سے ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھپٹے آنے
لگے طبیعت صاف ہوتی گئی اور جب دریا کے کنارے پہنچا ہوں تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی

نہا کر اٹھا ہوں لمبی لمبی دریا بانی گھاس میں جو کنارے پراگی ہوئی تھی ایک لطیف خوشبو تھی جس نے
 بے حس نختوں کو بیدار کر دیا جہاں تک نظر کام کرتی تھی۔ پانی ہی پانی نظر آتا تھا، جس پر چلتے ہوئے
 بڑے بڑے مچھوے اور چھوٹی کشتیاں، ملاحوں کی پرشور رانگیاں اور لمبی لمبی ڈانڈوں کے
 پانی کو تیرنے کی مدھم آوازیں، ایک پرکیف منظر پیش کر رہی تھیں۔

چھوٹے سے دیلے پتلے قلی نے کاؤ کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے میرا اسباب
 اتار کر رکھا۔ اسی درخت کی چھدری چھدری چھاؤں میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بہت سا
 اسباب لئے بیٹھے تھے۔ غالباً کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے قلی کو جیب سے دو فی نکال کر
 دی اور اس سے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟

”عبداللہ“

”تو عبداللہ ہمیں کہیں سے کشتی کا انتظام کر دو، دیکھو؟ ضرور“

عبداللہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ”صاحب ایک کشتی تو میری اپنی ہی ہے، ٹھہریے، میں اپنے
 چھوٹے بھائی کو بلاتا ہوں، ہم دونوں آپ کو پالے چلیں گے، ساڑھے تین روپے کرایہ ہوگا۔“
 جب عبداللہ چلا گیا تو میں نے زمین پر بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھا، ریت کے بڑے بڑے ٹیلے
 کاؤ اور تنگ کے درختوں کے چھند، اُتتے ہوئے ماہی خور، پھر میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف توجہ
 کی، لڑکی بیٹھ بیٹھے، دریا کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی، اُس نے ایک گہرے رنگ کی سبز ساڑھی
 پہن رکھی تھی جس کا کنارہ سنہری تھا۔ لڑکا میری طرف دیکھ رہا تھا، اُس نے بھوسے رنگ کا کپڑا
 اور ایک خاکی نکر پہن رکھی تھی گلے میں ایک خوش رنگ ٹائی بھی تھی۔ مجھے اپنی طرف ہنسنے دیکھ کر

کہنے لگا: آپ کہاں جا رہے ہیں؟

جہلم کے پار ایک گاؤں ہے، وہاں میرا گھر ہے۔ بس وہیں جا رہا ہوں اور آپ
میں نے مستفسر انداز نگاہوں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا:

لڑکے نے جواب دیا: ”ہم لاہور جا رہے ہیں، میں تو جموں میں تعلیم پاتا ہوں مگر یہ... میری
ہمشیرہ ہیں، لاہور ایف اے میں تعلیم پاتی ہیں، انہیں پہنچانے جا رہا ہوں، اس سفر میں بہت
پریشانی دیکھنا پڑتی ہے۔ اب یہاں ملالاجہل بہت تنگ کرتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ سے بیٹھے ہیں
کہ کوئی چھوٹی سی کشتی علیحدہ ہمارے لئے مل جائے تو اس میں سوار ہو کر پار چلے جائیں
مگر یہ ملالاجہل لوگ کہتے ہیں کہ کوئی چھوٹی کشتی سرے سے ہے ہی نہیں۔ سب بڑے بڑے
مچھوے ہیں۔ جن کے دام بھی بہت مانگتے ہیں، آٹھ روپیہ، دس روپیہ، یہ تو دن دہائے
ڈاکہ ہے۔ کتنی پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔“

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”آپ گھبراہیے نہیں، اب کشتی مل جائے گی میں
سب انتظام کئے دیتا ہوں اور ہم آرام سے جہلم پار پہنچ جائیں گے۔“

لڑکی نے میری طرف دیکھا اگر میں یہ کہہ دوں کہ اس جیسا خوبصورت اور بھلا بھلا لاہور
میں نے آج تک نہیں دیکھا تو یقیناً ایک جھوٹ ہو گا۔ لیکن یہ کہہ دینے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں
کہ اس کے چہرے میں کچھ ایسی عجیب کشش اور موتہنی تھی جس نے مجھے ایک دم مسحور کر لیا۔ صرف
ایک لمحہ کے لئے اُس نے میری طرف دیکھا پھر وہ گنتی گنتی بلیکس اُس کے رخساروں پر چھب گئیں
وہ کشمیر کے حسن صانع کا ایک نادر موتہ تھا، سو قد و لاؤنگٹ، لیکن جس کی

خمسرو۔ سفید رنگ کا۔

مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی ظاہری خوبصورتی سے بھی بڑھ کر اُس کی نگاہوں کا حزنِ ملال
 تھا جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا، اُف، وہ المناک گہرائیاں، اُس ایک لمحہ میں مجھے ایسا
 محسوس ہوا کہ بین بلی کی سی سرعت کے ساتھ کسی کے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ پھر لکا لکا مجھے
 تھک کر سی لگی اور میں نے اپنے آپ کو کنارے پر پایا۔ کس نہ عجیب احساس تھا اگر یہ احساس صرف
 ایک لمحہ تک ہی محدود تھا۔ دوسرے لمحہ میں وہ جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف متحسّس
 نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، اب اس کا چہرہ صاف اور بھولا بھالا تھا۔ قہر کم کے جذبات سے
 عاری ہو کر دل پر ایک نیم خطراری کیفیت طاری ہو گئی۔

اتنے میں اور دوسرا قرآ کر رخت کے نیچے بیٹھ گئے، پہلے ایک بوڑھا آدمی، سفید ریش
 لالٹھی ٹپکتا ہوا آیا اور رام رام کرتا ہوا میرے نزدیک بیٹھ گیا۔ پھر بچہ اٹھائے ہوئے وہی کم عمر
 کی بد صورت عورت نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک تلی ٹرنک اور گھڑی اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ
 عورت بھی لڑکی کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور چھوٹا بچہ سبز سا ڈھکی کے پتوں کو کھینچنے لگا۔
 تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ بھی آگیا اور کچھ وقفے کے بعد اُس کا بھائی ایک
 کشتی کو کنارے پر لے آیا۔

عبداللہ نے مجھے سکر کر کہا۔ "چلتے کشتی میں بیٹھئے۔"

بوڑھے آدمی نے مخاطب ہو کر کہا۔ "مجھے بھی لے چلو بابا۔ رام تمہارا بھلا کہے۔"
 بد صورت عورت بھی اٹھ کھڑی ہوئی، کہنے لگی۔ "اگر آپ پرانے مانیں تو میں بھی اس کشتی میں بیٹھ
 جاؤں مجھے آج گھر اذالہ پہنچنا ہے، اگر یہ گاڑی نہ ملی تو پھر . . . اب شام بھی ہوئی

جابر ہی ہے اور میں اکیلی ہوں۔“
 ہم کشتی میں جا کر بیٹھ گئے، تیلوں نے مال و سیاب کشتی میں قرینے سے رکھ دیا
 عبداللہ اور اس کے بھائی نے آستینیں اوپر چڑھا لیں اور ایک ایک ڈانڈا ہاتھ میں
 لے کر کشتی کے دونوں سروں پر کھڑے ہو گئے۔

اللہ کا نام لے کر کشتی چلی، عبداللہ نے گانا شروع کیا

جس دانال لیندیاں بڑا پارے

ڈاچی والیا امر پھارے

عبداللہ نے رک کر پوچھا: ”آپ کو میرے گانے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“

لڑکے نے جلدی سے کہا: ”نہیں، نہیں، ضرور گاؤ، تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔“
 عبداللہ نے پھر گانا شروع کیا۔ وہی ”ڈاچی“ کا پرانا گیت، جسے گانے کے لئے

سوز چاہئے ساز نہیں۔

ایک ساندنی سوار کو صحرا میں سے گزرتے دیکھ کر ایک اداس حسینہ جو اپنے محبوب کی
 تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسے رک جانے کو کہتی ہے اور پھر اس سے التجا کرتی ہے کہ تو مجھے
 ساندنی پر بٹھا کر میرے بچھڑے ہوئے محبوب کے ملائے۔

ڈاچی والیا! موڑیں ہمارے

ڈاچی والیا! پھل نال دے

لڑکے نے آہستہ سے کہا: ”ظالم! بہت اچھا گاتا ہے، کیا سر ہلاکلا ہے، مجھے گانے کا بہت

شوق ہے۔ ذرا سنبھلتو۔ . . .

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بھائی کے شانوں سے سر لگائے ایک طرف مڑی تھی۔
 تھی، آہستہ سے اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے لبوں پر ایک عجیب یاس انگیز مسکراہٹ
 آگئی، نہایت آہستہ سے اُس نے اپنے بازو چھپاتی پر باندھ لئے اور ٹانگیں پھیل کر نشست
 پر لیٹ گئی۔ اس طرح کہ میں اس کے نصف چہرے کو دیکھ سکتا تھا، اُس کے خوبصورت
 ہاتھوں کو، اس کے نازک ٹخنوں کو

میسری ڈاچی سے گل و پتہ ٹیلیاں

میں تاں ماہی نوں منادوں چلیاں

عبداللہ کی پرسوز آواز نے میرے جذبات کی سمٹی ہوئی دنیا میں تلاطم پیدا کر دیا، میرا دل
 ایک عجیب لذت درد کے مزے لینے لگا۔ کیسی خلش تھی، ہلکی، مٹی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نفخے
 کی ہر دھڑکی میری جھینہ کی رنج کھینچ ہوئی چلی آ رہی ہے، یاد ریلے جہلم کی وسیع چادر آب
 ایک صحرا ہے جس میں ہماری کشتی ”ڈاچی“ بنی ہوئی محبوب کی تلاش میں جا رہی ہے۔ روٹے ہوئے
 محبوب کو منانے کے لئے۔

ڈاچی ۔ ۔ ۔ ۔ میں تاں ماہی نوں منادوں چلیاں

لڑکی نے چپکے سے ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے، اُس کے بھائی نے نہیں دیکھا
 لیکن میں نے اسے دیکھ لیا۔ کیا ڈاچی کے حسین نفخے نے لڑکی کے دل میں محبت کی دبی ہوئی آگ کو
 روشن کر دیا تھا، نہیں تو یہ آنسو کیسے؟ میرا دل اس مجید کو جاننے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ وہ کس

بچھڑے ہوئے محبوب کی یاد میں رو رہی تھی، میں نے چاہا کہ میں گلاب کی نرم دنازک تہیوں سے اُس کے آنسو پونچھ ڈالوں اور اُس سے پوچھوں: بتالے حسینہ! تجھے کیا غم ہے؟
 اس کے بجلانے میں نے اُس بد صورت عورت کی شرمائی ہوئی نگاہیں اپنے چہرے پر جمی ہوئی دیکھیں۔ مجھے دیکھ کر اُس نے لجا کر اپنی آنکھیں نیچے کر لیں اور اپنے بچے پر جھک گئی۔

چھپک چھپک چھپک کشتی
 بھاگی جا رہی تھی، اڈانڈیں باری باری ہل رہی تھیں مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ دریا میں ڈوب رہا تھا۔ دریا کی خاموش سطح پر ایک غیبی 'نازک' زالی، اسطرانڈنی جھلکتی تھی۔
 میں نے سمجھا یہ غروب آفتاب نہیں، نورِ سحر ہے، مغرب نہیں مشرق ہے، روشنی کا منبع اُٹھ رہا ہے، ہم غیر فانی انسان ہیں جو اس کبھی نہ غرق ہونے والی کشتی پر سوار ہو کر اپنے محبوب کے ملنے جا رہے ہیں۔ اپنے ابدی محبوب کے۔

”میں تاراں ماہی نول منادوں چلیاں“
 چپ . . . چپ . . . شپ . . . شپ . . . کشتی بھاگی جا رہی تھی۔
 شام ہو گئی۔ اندھیرا بڑھتا گیا، عبداللہ خاموش ہو گیا۔ پھر ایک دلکش انداز سے سفید دودھ جیسی بے داغ چاندنی کھل گئی اور مجھے ڈل میں تیرتے ہوئے کنول کے پھول یاد آ گئے
 کشتی کے چاروں طرف دور دور تک پانی کی ہلکی ہلکی ٹوٹتی ہوئی لہروں پر ایسا معلوم ہوتا تھا
 کہ کنول کے لاکھوں پھول کھل گئے ہیں

بوڑھا آہستہ آہستہ "رام رام" جوپ رہا تھا، بد صورت عورت دزدیدہ لگا ہوں سے
 کبھی مجھے کبھی خاموش لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیتی تھی۔ لڑکے نے ایک دو بار اپنی بہن کی طرف
 دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "بچاری ثنا، ماہ سفر کی تکان سے چور ہو کر آخر سو گئی ہے
 یہ سفر کتنا پریشان کن ہے۔"

کیا وہ واقعی سو رہی تھی، یا آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ بالکل بچیں و حرکت،
 ایک مریں خمبہ کی طرح پڑی تھی، یا شاید کسی سپنے کی ٹھنڈی چھائل میں، سناؤں کی کیکپاتی ہوئی
 لانتا ہی دنیا میں اپنے خمبو سے مل رہی تھی، یا پھر اس کی آواز روح چاند کی کرنوں میں بھٹکی
 ہوئی کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ ہاں، مگر کس کو؟
 آخر ایک طویل عرصہ کے بعد اس طویل سکوت کو عبد اللہ نے توڑ دیا۔ "لو وہ کتنا راگیا"
 اس نے ڈانڈ کو زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

کنائے پر پہنچ کر میں نے لڑکے سے کہا: "آپ جا کر تانگہ و انگہ درست کریں۔ میں یہاں
 قلیوں کا انتظام کرتا ہوں۔"
 تانگے واول کا اڈا کوئی فرلانگ بھر دور تھا۔ لڑکا تانگے کا انتظام کرنے گیا۔ میں
 نے عبد اللہ سے کہا: "ذرا کہیں سے قلیوں کو تو بلو اؤ۔"
 عبد اللہ کہنے لگا: "اب اس وقت یہاں دریا کے کنارے قلی کہاں سے آئیں گے۔"
 "تو پھر اب کیا کیا جائے؟"

”میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ سب دونوں بھائی دُزین پھیرے لگا کر آپ کا اسباب
 ”تاگوں پر رکھ دیں۔ چار آنے فی پھیلا لیں گے۔“
 ”اچھا یونہی سہی، اٹھاؤ اسباب اور ان زر بصورت عورت کی طرف اشارہ کیے
 کہ بھی اڈے پر لے چلو۔“

— عبداللہ کے آخری پھیرے پر میں نے کشتی میں سوئی ہوئی لڑکی کو جگا دیا۔ اٹھے
 اب تو جہلم کا دوسرا کنارہ بھی آگیا۔“

میری زبان سے پہلا لفظ ادا ہونے پر ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”یقیناً سب نہیں
 رہی تھی۔ چاندنی رات میں اُس کا رنگ زعفران کے پھول کی طرح زرد پڑ گیا تھا اور ہونٹوں
 پر وہی یاس نگینہ مسکراہٹ تھی۔“

میں نے بڑے سے ایک روپیہ نکال کر کہا: ”ایک روپیہ کاغیر ہوگا۔“
 اُس نے ہینڈ بیگ کھول کر پیسے نکلے اور مجھے دے دیئے۔ ”وہ نرم و نازک
 مخروطی انگلیاں برف کی طرح ٹھنڈی تھیں۔“

میں نے عبداللہ کو انعام دیا۔ اُس نے جھجک کر سہم کو سلام کیا اور پھر سہاری طرف
 پیچھ موڑ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔

ہم خاموش چلے جا رہے تھے۔ ہمارے آگے بڑھنا لڑھی ٹیکتا جا رہا تھا، چند قدم
 چل کر میں نے شناسا سے عزت کر کے پوچھا: ”آپ کشتی میں رو رہی تھیں؟ کیوں؟“

”خاموشی چلتی گئی تھی۔ کھانے سوتے۔“

میں نے پھر کہا: میں نے یقین جانئے نہایت دلی خلوص سے سوال کیا ہے۔ میں دل سے
چاہتا ہوں کہ آپ اپنا دکھ مجھ سے کہہ سکیں اور میں آپ کے کسی کام آسکوں کوئی ہرج ہے؟
اُس نے نمناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ یکایک کچھ سُنکر
وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر ٹھٹھک گئی، وہ کرنے کو تھی کہ میں نے اسے ایک بازو سے تھام کر سہا
دیا۔ عیسیٰ جاننے کی طرف مٹھ کئے ہوئے گارہا تھا

ساڈی ڈاچی دے گل وچہ ڈھولنا

جھوٹے سبناں مے نال کی بولنا

ڈاچی والیا موڑیں

آواز، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دور پر بے جہلم کے پھیسے ہوئے پانیوں پر چاند کی سحر نشاں کرنوں
پر لرزتی ہوئی آرہی تھی۔ انداز بیان میں ہلاکی شغفی تھی اور فقروں میں ایک بے پناہ طنز جو دل کو
چھیدے ڈالتی تھی۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا وہ کانپ رہی تھی اور جلد بزدل قدم اٹھانے کی
کوشش کر رہی تھی۔ شاید وہ اس حزنِ نغمے کے سیلِ بے پناہ سے دور بھاگنا چاہتی تھی وہ
طوفانِ جو اُس کی بے قرار رُوح کے پیچھے بھاگ رہا تھا،
باقی راستہ ہم نے خاموشی میں طے کیا۔

جب میں انہیں تاگوں پر سوار کر چکا تو لڑکے نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: شکریہ بہت
بہت شکریہ ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی کیا آپ کا گاؤں یہاں سے نزدیک

ہے؟
 "بس کوئی تین چار میل ہوگا، وہ سیدھی گپڈنڈی جا رہی ہے پیدل ہی
 جانا ہوگا"

بد صورت عورت نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے اور پھر سر جھکا لیا
 میں نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا یا، دو دفعہ، ایک دفعہ بد صورت عورت کو دیکھ کر اور آخری
 بار لڑکی کو دیکھ کر لڑکی نے میری طرف مبہم، خمار آلود، اندوگین نگاہوں سے دیکھا، وہ نگاہیں شاید
 کھل کر دل کا راز کہہ دینا چاہتی تھیں، مگر کامیاب نہ ہو سکیں، ان آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک
 پیدا بھی ہوئی مگر چھپوڑا ہی گم ہو گئی، جیسے کوئی حسین سنگرزہ سمندر کے گہرے نیلے پانیوں
 میں کھو جائے، اُس کا داہنا بازو تھوڑا سا اوپر اٹھا اور پھر نیچے گر گیا، چوڑیوں کی جھنکار پیدا
 بھی ہوئی اور پھر ایک لمحہ میں لڑتی ہوئی کہیں غائب ہو گئی جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور
 فضا میں گھل جائے اب وہ نظر نیچی کئے ساڑھی کا پلو ٹھیک کر رہی تھی۔
 "گڈ بائی" میں نے جلدی سے کہا۔

تاڑکا چلنے لگا، لڑکے نے زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "گڈ بائی۔"

سیدھی کھیتوں کے سچوں بیج گپڈنڈی جا رہی تھی، آسمان پر ستاروں کے درمیان بھی
 اسی طرح ایک گپڈنڈی بنی ہوئی تھی "یہ سفر کب شروع ہوا؟" میں سوچنے لگا
 یہ دونوں گپڈنڈیاں کدھر جا رہی ہیں؟ یہ سفر کبھی ختم ہوگا؟

9

اندھا چھتر پتی

یوں تو شہر میں کئی اندھے بھکاری گھومتے رہتے تھے، لیکن بڑا لطف یہیں اندھے
چھتر پتی کو چھپڑنے میں آتا تھا، وہ کسی اور گداگر کو ستانے سے متیسرہ ہو سکتا تھا، کہنے
کو تو بھگت بھی اندھا ہی تھا، لیکن انھیں رکھنے والوں سے بھی چالاک، بازاروں
اور گلیوں میں اس طرح بے خطر ہو کر چلتا تھا، گویا سارا شہر اس کی ملکیت ہے، اس کی
آنکھوں کے پوٹے لال لال اور ڈراؤنے تھے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے
تنگ کرنے کی جرات یہیں بالکل نہ تھی اور پھر اس کے پاس ایک بہت بڑا خطرناک سونٹا
ہوتا تھا، جسے وہ غیض و غضب کی حالت میں زور زور سے گھمایا کرتا تھا۔ اگر کوئی
رکھا ڈنڈے کی زد میں آگیا، بس اس کی خیر نہ تھی، اسی طرح کئی پٹ چکے تھے اور کئی

پٹے جانے سے بال بال بچے۔

لیکن اندھا بھگت بتنا خطرناک تھا، چھترپتی اتنا ہی سیدھا سادا غریب طبیعت کا مالک تھا۔ وہ بڑی آسانی سے ہمارے ہتھے چڑھ جایا کرتا تھا، پھر اس سے کوئی اتنا ڈر بھی تو نہیں لگتا تھا، اس کی آنکھوں کی پتلیاں بالکل ہماری طرح تھیں اور آنکھوں کی سپیدی بھی دودھ کی طرح بے داغ نظر آتی تھی، پیوٹوں کا رنگ بھی سرخ اور ڈوانا تھا، اُسے آج تک کسی نے بات کرتے نہ سنا تھا، اس کے ہاتھیں اندھے بھگت کی طرح ہر وقت ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا تھا، جسے وہ صرف انتہائی ضرورت کے موقع پر اپنے آپ کو سچانے کے لئے استعمال کرتا تھا۔

شہر میں جتنے بھی فقیر تھے، ہر ایک کو چڑانے کے لئے اُن کے الگ الگ نام رکھ دیتے تھے۔ لمبا، رنگا، گیرے، کپڑے پہنے ہوئے ایک باوا تھا، ذات کا برہمن تھا اور بہت کڑوا مزاج رکھتا تھا، چنانچہ اسے سب "باوا کریلا" کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ خیال کرتے ہونگے کہ وہ اس نام سے بہت خوش ہوا ہو گا اور اُس نے ہماری جدتِ طبع کی داد دی ہو گی، مگر نہیں بلکہ وہ یہ نام سن کر چڑھتا تھا "باوا کریلا آیا، باوا کریلا، باوا کریلا" اسی طرح جتنے پکارتے درجنوں بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور اس سے جی بھر کر گایاں سنتے تھے۔ "حرام زادے میں کیا کرے گیلا ہوں، تمہارے باپ کرے ہیں، تمہاری مائیں، تمہاری بہنیں، تم سب کرے گیلا ہو، خدا تمہیں غارت کرے"

اور لڑکے سنتے، خوش ہوتے، تالییاں بجاتے،

ایک لڑکا پھر چیخ کر سناٹا ادا... باوا... کر لیا۔

دوسرا نقل کرتا: گاڑی لوگے، ٹھیلہ؟

تیسرا: پیسہ لوگے، ڈھیلہ؟

چوتھا: ادا... باوا... کر لیا!

اور باوا کر لیا سُن سُن کر دانت پستنا، اس کے لب کف آلود ہو جاتے۔ حرمزاد
ٹھہرو، جاتے کہاں ہو۔ یہ کہہ کر وہ اپنی لکڑی کی کھڑاویں اتار کر ہماری طرف پھینکتا اور ہم
قہقہہ لگاتے ہوئے تتر بتر ہو جاتے۔

ایک کا نام سائیں منگا تھا، از بس کہ وہ ہمیشہ رنگارنگ رہتا تھا۔ زود والا اعتقاد لوگ
اسے پیر اور عاقل مانتے تھے، وہ صرف گوشت کھاتا تھا اور وہ بھی کچا، بچے عموماً قبرم کے توہا
سے آزاد ہوتے ہیں۔ اسے چڑانے کا ڈھب بھی نہیں آگیا۔ ایک دن ایک لڑکے نے اُسے کہہ دیا
”سائیں منگا، ادا، ادا، ادا“ تو سائیں صاحب اُس کی طرف پتھر لیکر دوڑ پڑے، بس اب کیا تھا
جدھر سائیں صاحب جاتے ”منگا ادا، ادا، ادا“ کہہ کر ڈکے آسمان سر پٹھا لیتے۔

یا پھر جو بدری ہریج بھی ایک زالا فقیر تھا، اسے اپنے نام سے بہت پیار تھا، اور
بس یہی نام ہی آخر اُس کی قبرستی کا باعث بن گیا۔ نام تھا ہریج، لڑکوں نے ”گیدڑ“ کہہ کر
پکارنا مناسب سمجھا، بازار میں، گلی میں، سڑک پر جہاں کہیں وہ مل گیا، بس لڑکوں نے
”گیدڑ، گیدڑ، گیدڑ“ کہہ کر اُسے تنگ کرنا شروع کیا۔

دوسرا جواب دینا۔ گیدڑ۔

پھر سب مل کر کہتے۔ ہرنج گیدڑ، ہرنج گیدڑ۔

ہرنج گایاں دینا، لڑکوں کو پیٹنا، کئی بار اپنی چھاتی کو ٹٹے لگ جاتا
ایک دن بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک دوکان پر چند بے فکر نوجوان دکاندار ناٹش کھیل رہے
تھے۔ ایک ساتھی نے اپنے دوسرے ساتھی سے پتہ پھینکتے ہوئے کہا۔ مائی ڈیر
ہرنج نے سمجھا اُسے کسی نے مائی ڈیر کہہ کر مخاطب کیا ہے، بس پھر کیا تھا۔ وہیں
کھڑا ہو کر گایاں دینے لگا، تم مائی ڈیر، تنہا را باپ مائی ڈیر، میرا نام ہرنج ہے، میرے باپ کا
نام رام بھیجا تھا۔ وہ تحصیل میں چپڑا اسی تھا، ہم برس ہیں۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔
ایک نوجوان بولا۔ ہرنج۔

دوسرے نے جواب دیا، مائی ڈیر

اب ہرنج جھجھ سے گزرتا، اُس پر مائی ڈیر کے آواز کے کئے جاتے، پھر تو شعل ہو گیا
کہ اُس کے لئے ہر روز ایک بیانا نام تجویز ہوتا تھا اور ہر روز اُسے تنگ کیا جاتا۔

ہاں لیکن چھترتی ان سب نر لا تھا۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتا۔ آہستہ آہستہ راستہ
ٹٹولتے ٹٹولتے گزر جاتا، اُسے چڑانے کے لئے ہم نے اپنے سب گرد آوازے، لیکن بلیوڈ
آخر ایک دن جب ہم سب اُس کے گرد گھیر اڑے اُسے تنگ کرنے کے لئے اپنی تمام
کوششیں صرف کر رہے تھے۔ ایک اجنبی ہمارے راستے سے گزرا، پہلے تو وہ بہت
دیر مٹا شاہد بھتا رہا، پھر آہستہ ٹھک کر اُس نے ایک لڑکے کے کان میں کہا۔ اس کے قریب

جا کر اونچی آواز میں کہہ دیکھنی، مائے مکھنی، ہائے مکھنی۔

اُس لڑکے نے ایسا ہی کیا۔

پھر ایک عجیب نظارہ دیکھنے میں آیا، چھترپتی زور زور سے ڈنڈا گھمانے لگا جس پر لڑکے چلا چلا کر مکھنی کا نام لیکر پکارتے، چھترپتی کی حالت بگڑتی جاتی، وہ زور زور سے چیخنے لگا اور ڈنڈا گھماتا۔ اب ہم سب مکھنی مکھنی، کہہ کر اُس کے گرد باج رہے تھے، مسرت کی بجائی ہائے ہائے آگئی تھی۔ اُس بجائی کا نام تھا مکھنی۔

بہت مدت کے بعد آج چھترپتی پھر بہارے متھے چڑھا، وہ اکثر کئی کئی دن غائب رہتا تھا، یونہی کسی جگہ چپکا پڑا رہتا۔ اگر کوئی ترس کھا کر سوکھ مکنڈا دے دیتا تو لے لیتا اور بھوکا ہی پڑا رہتا۔ آج کئی دنوں کے بعد نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے کشمیری محلہ سے باہر نکل رہا تھا کہ لڑکوں کی نظر پڑ گئی۔

ارے وہ رہا

کون؟

چھترپتی

ارے متو، دلو، شریف، موہن، چھترپتی آیا، وہ چھترپتی آیا۔
شریف کی اماں نے شریف کو دامن سے پکڑ کر گھر کے دالان کے اندر گھسیٹنا چاہا۔ بیٹا مت جاؤ فقیروں کو چھیڑا نہیں کرتے۔

ہو نہ بہ کہہ کر تشریف بھاگ آیا، پل بھر میں بیس پچیس لڑکے چھترتی کے گرد جمع ہو گئے
چھترتی تمہارا نام کیا ہے ؟

چھترتی تم اتنے دنوں کہاں رہے ؟

چھترتی یہ سوٹا تم ہمیں دے دو۔

چھترتی تم بولتے کیوں نہیں ؟

چھترتی کے جسم پر چٹکیاں لی گئیں چھترتی کو چھوٹے چھوٹے کنکر وں کا شکار بنایا
گیا۔ چھترتی کو ادھر ادھر گھسیٹنے اور اُس کا سوٹا پھینکنے کی ناکام کوشش کی گئی، لیکن
ٹس سے مس نہ ہوا، یوں، وہ بہت گھبرا ہوا معلوم ہوتا تھا اور ہمارے نرغے سے نکلنے
کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس قدر تنگ کرنے پر بھی خاموش تھا۔
اس کی یہی خاموشی ہمیں مجبور کر رہی تھی۔

آخر ہم نے آخری حربہ استعمال کیا — ”چھترتی ! مکھنی ! مکھنی ! مکھنی !“

چھترتی پہلے تو بالکل چپ رہا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے آپ پر جبر کر رہا ہے، پھر اسکی
حالت متغیر ہوتی گئی، وہ کانپنے لگا اور ہمارے نرغے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن
ہم اُسے کہاں جانے دیتے تھے ؟ مکھنی، مکھنی، مکھنی۔ آخر وہ چپیں مارتا ہوا انتہائی جوش
کی حالت میں ہمارے نرغے کو توڑ کر نکل آیا، ہم اس کے پیچھے پیچھے مکھنی مکھنی کہہ کر
بھاگنے لگے، اب وہ سوٹا گھماتے ہوئے تیزی سے دوڑنے لگا۔ ہم اس کے پیچھے بھاگتے گئے۔
ایک ایک بھاگتے بھاگتے اسے ٹھوکر لگی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے گھٹنے سے خون

بہنے لگا۔ اُسے اس طرح زخمی دیکھ کر سب لڑکے ادھر ادھر بھاگ گئے

اُس رات غریب چھترتی کو ستانے کے جرم کی پاداش میں بہت سے لڑکے چلے گئے۔ دیوان خانے کا دروازہ بند کر کے بڑے بھائی نے لافوں اور کٹوں سے میری خوب ممت کی ”غریب! دھول کو ستاتے ہو۔ ایک دن تمہارا بھی یہی حال ہوگا“ وغیرہ وغیرہ لیکن اس قسم کی دنیا لوسی باتوں کا ہم پر کیا اثر ہوتا، لٹائیں نے نہایت کر لیا کہ چھترتی کو اندھے بھگت کو سائیں مگے کو غرضیکہ شہر کے ہر ایک بھکاری کو اب خوب وقی کیا جائے گا۔ کم بخت ہمیں پڑواتے ہیں۔ ٹھہرو تو بچہ جی۔ اب دیکھیں تم ہم سے بچ کر کہاں جاتے ہو؟ اسی طرح میں دیکھتا ہوں کہ ایک کونے میں پڑا سسکیاں لیتا ہوا سہ چتا رہا۔ ایک فصہ ما کھانے کا بلاوا دینے کے لئے بھی آئی۔ چلو ماں جی تمہیں کھانے پر بلاتی ہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ پھر بہت دیر گزری میں انتظار کرتا رہا۔ لیکن کوئی مجھے منانے کیلئے نہ آیا، نہ بڑا بھائی، نہ پتاجی، نہ ماں، نہ آہ اس دنیا میں ایک غریب لڑکے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ لوگ کتنے سنگدل ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میری ہچکیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔ میں نے سوچا کہ میں اگر یہاں سے اسی دم بھاگ جاؤں، کہیں دور، تو پھر یہ لوگ میری تلاش کریں گے، بڑے بھائی دستِ سب مل کر کہیں گے میں نے اسے کیوں مارا۔ والدہ کہے گی۔ یہ سب تیرا ہی قصور ہے، اب تو ہی اسے ڈھونڈنا۔ میں اپنا لال تجھ سے لوں گی۔ اور بڑے بھائی حیران ہو کر میری تلاش میں ماں سے پھرں گے، اگر کیا میں ان کو مل سکوں گا۔ ہرگز نہیں، میں بہت دور دور . . .

اتنے میں دیوان خانے کا دروازہ کھلا۔ پتاجی، بڑے بھائی اور تین چار اُن کے دوست اندر داخل ہوئے، بہت ہشاش بشاش نظر آتے تھے، کسی نے میری طرف توجہ بھی نہ کی، میں اپنے کونے میں سکڑ کر لیٹا رہا۔ کوئی حقہ پی رہا تھا۔ کوئی ناش کھینے لگا، کوئی اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا یا کیک اخبار پڑھنے والے آدمی نے بڑے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔ آج میں نے چھترپتی کے متعلق چند ایک دلچسپ باتیں سنیں، بڑی عجیب داستان ہے سنو گے؟

سب لوگ ہمہ زن گوش ہر گئے۔ حقے کی گڑ گڑاہٹ کے ساتھ اس نے چھترپتی کی داستان حیات سنانی شروع کی۔

چھترپتی ذات کا برہمن ہے اور سیکھو گاؤں کا رہنے والا ہے جو گلبرگ سے سینتیس میل کے فاصلے پر مغرب کی طرف واقع ہے۔ اُس کے ماں باپ بچپن ہی میں اسے داغ مفارقت دے گئے، رشتہ داروں نے اُس تھوڑی سی زمین پر بھی قبضہ کر لیا، جو ساہوکاروں کی دست برد سے بچ کر چھترپتی کے حصہ میں آئی تھی۔ اب چھترپتی گاؤں کا یتیم تھا، وہ ہر کسی کو اپنا چچا کہتا کھیتوں میں کام کرتا، چٹھے سے پانی کے گھرے بھر کر اپنے رشتہ داروں کے ہاں لیجاتا۔ ریوڑوں کی رکھوالی کرتا، لوگوں کے کپڑے دھوتا، غرضیکہ اسی قسم کے درجنوں کام کرتا، اُس کے عوض میں اسے روٹی مل جاتی تھی اور کبھی کبھی پہننے کے لئے گاڑھے کی ٹوپی بھی، کبھی کوئی اسے ایک سیاہ رنگ کے کپڑے کی قمیص سلوا دیتا اور کبھی کوئی پاجامہ، اسی طرح اپنے مہربان چچوں کے درمیان وہ پلتا رہا اور اٹھارہ برس کا ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چھترپتی اپنی جوانی میں بہت خوبصورت تھا

کرٹیل، نرمنہ، طبیعت کا صاف کام تو وہ اب بھی ہر ایک کا پورا کر دیتا تھا لیکن اب شباب
 کے ساتھ ہر لمحہ اُس میں خود داری کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اُس کا پہلا ثبوت یہ تھا کہ اُس نے
 گاؤں کی فوجوان اور طرحدار لڑکیوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ گاؤں کے
 یتیم کو اس سے پہلے اس قسم کی جرأت کبھی پیدا نہ ہوتی تھی اور نہایت افسوس سے کہنا پڑتا
 ہے کہ سیکل کی گلاب کی کالی کی طرح حسین و نازک و شیریں بھی اس سے نہایت ملاطفت
 سے پیش آنے لگیں اور خاص کر مکھنی جو گاؤں کی لڑکیوں میں سب سے بانگی، پیاری اور
 البی لڑکی تھی، پہلے جب وہ اس سے ملتی تھی تو اول تو اس سے بات بھی نہیں
 کرتی تھی اور گردن بلند کئے ہوئے، کمر جھٹکا کر، وحشیہرنی کی طرح قریب سے گزر جاتی تھی
 لیکن اب بہ آہ اب چھتری کو ایسا معلوم ہوا کہ مکھنی کی تمام ادائیں صرف اُسی کیلئے
 تھیں اُس کی نرم ملائمت سے بھری ہوئی نگاہیں، اُس کے حمیدہ لبوں کا ہلکا، عجیب سا
 تبسم، اب وہ اس سے سخت کلامی سے پیش نہیں آتی تھی، کوئی لڑکی بھی اب اُسے تند و تیز
 لہجہ میں مخاطب نہیں کرتی تھی لیکن مکھنی کی باتوں میں کچھ اور ہی رس تھا۔ فورا ذرا محبت
 کی پہلی جھلک، پہلے پیار کا انوکھا مزہ، شیریں زبان، لوح چار آواز، پیارے پیارے
 ننھے ننھے فقرے، ہنستے ہوئے شرماتے ہوئے وہ اس طرح باتیں کرتی جیسے مہندہ سے
 پھول جھڑ رہے ہوں، کبھی کبھی چٹھے کے کنارے پر، کبھی کسی لہلہاتے ہوئے دھان کے
 کھیت کے قریب، کبھی بلند گھاٹیوں پر، پیسے لمبے دیو دار کے درختوں کے درمیان ریوڑ
 چراتے ہوئے وہ اپنے جاتی جاتی ہلکا ہلکا، ہنڈر، جھنگل کے جانوروں کی طرح

معصوم، یکا یک چھتر پتی کو دنیا بیٹھی اور مہربان نظر آنے لگی۔ آسمان پر بھاگتے ہوئے سفید بادلوں کو دیکھ کر اس کا دل کسی نامعلوم مسرت سے کانپنے لگتا۔ جنگل کے جھرنوں کی آواز میں اس نے ابدی زندگی کے نرالے اور سحر طراز گیت سنے اور پھر خود اس کی اپنی زندگی کے تار تار پر مسرت نغموں کی لے سے جھنجھناتے۔

مگر چھتر پتی کے چچوں کو اس کی خود داری اور سیکلو کی ماہ جبینوں کی شیریں کلامی ایک لمحہ نہ بھائی، کیا ہوا اگر وہ خوبصورت جوان تھا۔ آخر وہ . . . ان کے ٹکڑوں پر ہی پل کر جوان ہوا تھا۔ گاؤں کے یتیم کی گستاخ نگاہیں لوگوں کے دلوں میں تیز نیکی بھالوں کی طرح چھینے لگیں۔ کیا اُس کے پاس ایک بالشت بھر بھی زمین تھی؟ ایک گائے ایک بھینس، ایک بکری اُس کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا، اُسے کیا سختی تھا کہ وہ گاؤں کی پر بھر پور عورتوں سے تنہا بات کرے اور شادی؟ اس کے ساتھ شادی کرنے سے تو یہی بہتر تھا کہ بیوقوف لڑکی کو کسی دیوار کے ساتھ باندھ دیا جائے، دونوں صورتوں میں آفاقوں سے ہی تو مرنا تھا۔

چنانچہ ایک دن گاؤں کی پچاسیت نے جو بڑے بڑے برہمنوں پر مشتمل تھی، فیصلہ کر کے اسے گاؤں سے باہر نکال دیا۔

دو سال کے بعد جب چھتر پتی پر دس سے واپس آیا تو گاؤں والوں نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی، مکھنی کا باپ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ ساتھ ہی چھتر پتی کو معلوم ہوا

کہ اس عرصے میں اُس کی کئی ایک خالائیں، پھوپھیاں اور چچیاں پیدا ہو گئی ہیں، بات یہ تھی کہ چھترپتی دو تین سو روپے پر دیس سے کما لایا تھا اور پھر اس کے پاس کپڑوں اور دیگر اشیا سے بھرے ہوئے تین چار ٹرنک بھی تھے اور ایک نہایت ہی خوبصورت بستر، ایسا خوبصورت بستر آج تک گاؤں کے مردوں اور عورتوں نے کبھی نہ دیکھا تھا، گول گول خوشنما تکئے، شیش چادریں اور ایک چمکتا ہوا لحاف، ایسا خوبصورت بستر تو نمبر دار کے گھر پر بھی موجود نہ تھا۔ وہی گاؤں کے بوڑھے برہمن جنہوں نے اُسے گاؤں سے باہر نکال دیا تھا۔ اب غلط فہمی سے اُس کے سر پر بار بار ہاتھ پھیرتے تھے اور اُسے دیکھ دیکھ کر نہال رہے جاتے تھے۔ بڑی بوڑھی عورتیں ایک دوسرے سے باتیں کرتی ہوئی کہتی بھیتیں مٹا رہے ہمارا چھترپتی (ہر ایک رت ہمیشہ ہمارے چھترپتی پر بہت زور دیتی تھی) میری ٹھ میں ایک دوکان کا مالک ہے، وہ وہاں کیا نام ہے، موٹر اور بائیکل ٹھیک کرتا ہے کتنا اچھا لڑکا ہے۔ اُسے بھلا اس کی عمر کیا ہوگی۔ بس ہماری نہالوں کی عمر کا ہوگا۔

اور دوسری بوڑھی چچی منہ پھلا کر کہتی، وہ کیسے، تمہاری نہال تو اُس سے عمر میں

دو تین سال بڑی ہے، وہ بیچارہ تو بس میری بھانجی کی عمر کا ہوگا!

اسی طرح ایک ہندو گریگا، چھترپتی نے اپنی دولت خوش ہو کر دونوں ہاتھوں سے لٹائی، اکیلا مکھنی کا باپ دو سو روپیہ "قرض" کے بہانے لیکہ مضمر کر گیا، ٹرنکوں سے بھرے ہوئے کپڑے خالوں اور بڑی بہنوں اور بچھڑیوں نے ہفتیا لے اور وہ خوبصورت بستر نمبر دار نے عاریتاً مانگ لیا۔ کیونکہ اُس کے ہاں ایک شہری دھماں آٹا نکالتا تھا۔ بیچارا

چھترپتی مکھنی کے باپ سے "رشتہ" طلب کرتا رہا اور مکھنی کا باپ اُسے ہر روز ٹالتا رہا اور آخر جب چھترپتی کے پاس کچھ نہ رہا تو مکھنی کے باپ نے اُسے کہہ دیا، بھئی ابھی تو نہیں، بیابہ کا بہت سا دھندا کرنا ہے اور میں تم جانتے ہو غریب آدمی ہوں۔ اگلے سال

بہت اچھا، چھترپتی نے سر جھکا کر کہا۔

اور ہاں مکھنی کا باپ بولا۔ بات تو اب پکی ہو گئی ہے، مجھے تم ہر مہینے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہنا کیونکہ آخر بیابہ کرنا ہے، بہرہ بھی ہو گا اور برادری کو دعوت بھی دینا پڑے گی

رات کو پٹواری کے ہاں رت جگا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اور مرد پٹواری کے گھر کے آنگن میں اور دالان میں اور کمروں میں جمع تھے، ڈھولک بج رہی تھی اور رس سے بھلے ہوئے گلاس اور میٹھی روٹیاں تقسیم ہو رہی تھیں، حقروں کی گرگرٹا ہٹ، بوڑھوں کی کھانسی فوجوانوں کے تہقے، بچوں کا شور و غل، سبھی کچھ موجود تھا، اسی چہل پہل میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے چھترپتی اور مکھنی دونوں پٹواری کے گھر سے باہر نکل آتے اور ایک ہرے کھیت کے کنارے پختہ کی ایک چوڑی سی ریل پر بیٹھ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا چشمہ تھا اور ایک پتلا سا شمشاد کا پتھر جس کی ایک لمبی ٹہنی چشمے پر جھکی رہتی تھی۔

چھترپتی نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "میں کل واپس میرے بھلا جاؤں گا۔"

مکھنی چھترپتی کے قریب ہو گئی کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ کیوں؟"

"نہارا سے پتا جی کہتے ہیں کہ ہماری شادی اگلے سال ہوگی، اب انہوں نے مجھ

کتنی ہی مدت تک دونوں خاموش بیٹھے رہے
 چھترتی نے مکھنی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں بہت خوش ہوں مکھنی!
 ”ایک سال!“ مکھنی نے دھیمے لہجہ میں کہا
 ایک سال کا عرصہ بھی کیا ہوتا ہے، جلد بیت جائے گا۔ اس کے بعد . . .
 اس کے بعد . . . مکھنی؟

اس کے بعد! . . . مکھنی نے شیریں لہجہ میں کہا
 وہ دونوں چپ ہو گئے اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے آنے والے زمانے کے زریں خواب
 دیکھنے لگے، شمشاد کے نازک پتوں کے سائے پانی کی سطح پر کانپ رہے تھے۔ آسمان کے
 نیلے چشمے پر چاند اور ستارے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے اور مشرق سے ہواؤں کے
 لطیف جھونکے آرہے تھے جن میں گمرگ کے جنگلی پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی کھیت
 کے دوسرے کنارے پر سے لڑکیوں کے گانے کی آواز آرہی تھی۔

کر ڈھٹیا ہنی جُلے

کر ڈھٹیا ہنی جلے بنجارے

ہائے کن چنسی پھلیاں

ہائے کن چنسی کھیاں

کن چنسی پھگوارے

ہنی جلے بنجارے

مکھ کی دنیا میں کھوتے ہیروں کو بیک ایک بلند فہمہوں کی آواز نے جگا دیا، انہوں نے مڑ کر دیکھا، تو مکھنی کی چند سہیلیاں اُن کے سر پر کھڑی تھیں، ہنستی ہوئی دہری ہوئی جا رہی تھیں۔

ارمی مکھنی بے شرم! مکھنی بید مغنوں کی شاخ کی طرح لچکتی ہوئی اُٹھی، اور ایک زقند لگا کر اپنی سہیلیوں میں شامل ہو گئی، اُس نے شرم سے اپنا منہ چھپا لیا اور سہیلیاں اب اُسے مکوں سے کوٹنے لگیں، پھر ذرا بٹھکر نہ چھترتی کی طرف مڑیں اور اُسے گیتوں ہی گیتوں میں پیاری پیاری گایاں سننے لگیں۔ چھترتی مسکراتا ہوا سب کچھ سنتا رہا۔

اب داستان تھوڑی سی رہ گئی ہے چھترتی نے وہ سال جس طرح گزارا، یہ کچھ اسے ہی اچھی طرح معلوم تھا، ہر ہینہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر جس طرح بھی ہوتا تیس سنتیس روپے مکھنی کے باپ کو بھیجتا تھا۔ ہر ہینہ اُسے مکھنی کے باپ کے ایک دو خط آجاتے تھے جس میں اُس کی آنے والی شادی کا تذکرہ ہوتا تھا اور ماں اور دلوں کا تقاضا بھی پہلے سات ہینہ تو اُسے برابر خط آتے رہے مگر پھر بیک ایک خط آنے بند ہو گئے لیکن چھترتی متواثر روپے بھیجتا رہا۔ آخر جب سال ختم ہونے کو آیا تو اُس نے واپس گھر جانے کی تیاری کی، خوشی خوشی وہ واپس گھر لوٹا، خطوں کا نہ آنا اس کیلئے چنداں اہمیت نہ رکھتا تھا۔ ممکن ہے چھترتی نے سوچا کہ مکھنی کا باپ اب

اور یہ تھا بھی سچ، مکھنی کا باپ شادی کی تیاریوں میں بہت مصروف تھا، جلد ہی مکھنی کی شادی ہو جانے والی تھی، لیکن چھترپتی سے نہیں، بلکہ گاؤں کے ادھیڑ عمر کے نمبردار سے، اور پھر اس میں تعجب کی کیا بات تھی! وہ گاؤں کا نمبردار تھا، اور گاؤں میں پڑوسی کے بعد سب سے امیر خود پڑوسی بھی اس کی بات بہت کم ٹالتا تھا اور پھر مکھنی کے باپ کو روپوں کی سخت ضرورت تھی، وہ دھان کے لئے آبی زمین کے دو قطعے اور خریدنا چاہتا تھا۔

مکھنی حسین تھی۔ اس لئے پاک گئی، سرمایہ پرستوں کی دنیا میں ہر چیز منافع پر بھرتی ہے، منافع اور مفت ابلہ، جو زیادہ دام دے وہ خرید لے۔ مکھنی کے باپ نے اُسے دو دھان کے کھیتوں کے عوض بیچ ڈالا، اُس نے کیا بُرا کیا؟ اگر نمبردار ادھیڑ عمر کا تھا تو اس میں کیا حرج تھا، اگر یہ اُس کی تیسری شادی تھی تو اُسے اس کی کیوں پروا ہو، دور رہا جنی میں سب سے زیادہ خوبصورت، قیمتی اور حسین چیز روپیہ ہے، اس لحاظ سے مکھنی خوش نصیب تھی کہ اُسے نہایت خوبصورت اور حسین "خاوند ملا۔"

اور آخر میں جیسا دیوتاؤں نے کہا ہے، ایسا ہی ہونا تھا، قسمت کا لکھا اٹل ہے، غریب چھترپتی نے جب گاؤں پہنچا پھر مکھنی کی شادی ہو جانے کی خبر سُنی، تو کیا اُس کے دل پر آئے چل گئے، کیا اُس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نکلا؟ کیا اُس کے پتھر کے کلیجے سے ایک آہ نکلی؟ ہاں اتنی بات ضرور کہنی چاہئے کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، اور اُس نے یہ خبر سُن کر کسی سے بات تک نہ کی۔

تمام دن وہ ایک پتھر کی چٹان پر بیٹھا ہوا سیٹی بجاتا رہا۔ کئی
نوجوان اُسے دھارس دینے کے لئے آئے، لیکن پھر راستے ہی میں واپس مڑ گئے
ایک دو آدمیوں نے اسے کھانا کھانے کے لئے بھی کہا، لیکن اُس نے سر ہلا کر انکار کر دیا
شام ہو گئی۔ پھر شفق کی سُرخ رات کے اندھیرے میں مبدل ہو گئی، ایک دوکر کے
آسمان پر ستارے بھی نکل آئے اور چاند بھی، لوگوں نے اسے اپنے گھر چلنے کو کہا۔ لیکن
اُس نے پھر انکار کر دیا۔

اسی چٹان پر بیٹھے بیٹھے اس نے ساری رات بسر کر دی۔ وہ رات اس نے
کیسے بسر کی، یہ کوئی نہیں جانتا، اس کی ناکام آرزوؤں کی تلخ کامیاں اسے کہیں
محشرستان میں گسیٹ کر لے گئیں۔ وہ کسی نئے جہنم کی آگ تھی جو اس کے سسکتے ہوئے
دل سے اُٹھی اور اس کے ہوش و حواس کو اپنے شعلوں کی لپیٹ میں لیتی ہوئی اُس کی
روح کو کچل گئی۔ وہ کیا قیامت تھی کہ برقی ناگہاں کی طرح لپکتی ہوئی اور آنکھوں
میں اُس کے ظاہری و باطنی احساس کے ٹکڑے ٹکڑے کر گئی، یہ کس طرح ہوا، کیونکر ہوا؟
کیسے ہوا؟ اس راز کو کوئی نہیں جانتا، لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ جب دوسرے
دن صبح کو گاؤں والوں نے چھترتی کو اُسی چٹان پر بیٹھا ہوا پایا، تو اُس کی
آنکھوں کی بنیائی ختم ہو چکی تھی اور اس کی طاقت گویائی ہمیشہ کے لئے اسے
جواب دے گئی تھی۔

اس روح فرسا داستان کا اثر مجھ پر کتنی دن رہا اور میں کتنے دن ہی
اندھے چھترپتی کو ڈھونڈتا رہا تا کہ اپنے قصور کے لئے معافی مانگ سکوں، لیکن
اندھا چھترپتی مجھے کہیں نہ ملا، چند دن اور گزر گئے اور میں نے سنا کہ اندھا
چھترپتی مر گیا۔ اس کی لاش شہر سے باہر دور ایک سڑک کے کنارے پائی گئی۔
کہتے ہیں اس کے گھٹنے کے زخم میں زہر پیدا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ
تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

شام کے دھندلکے سے پہلے سیدہ اسمتی والوں نے اس کی لاش کو ایک
میلی سی وھوٹی میں لپیٹ کر نذرِ آتش کر دیا۔

مجھے کتے نے کاٹا

بات میں سے بات نکل آتی ہے، اس لئے ممکن ہے آپ پوچھ بیٹھیں کہ عنوان مجھے
کتے نے کاٹا کی بجائے مجھے باؤلے کتے نے کاٹا کیوں نہ سمجھا تو اس ضمن میں یہ عرض ہے
کہ مجھے آج تک بھی جب اس حادثہ کی گز سے ہونے ایک مدت ہو چکی ہے، اس امر کا پتہ نہیں
کہ وہ کتا جس نے مجھے کاٹ کھایا تھا باؤلہ بھی تھا کہ نہیں، دراصل باؤلے اور غیر باؤلے
کتے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ ایک پاگل اور ذی ہوش انسان میں، یعنی دونوں میں تمیز کرنا
بہت مشکل ہے، یہ امر صرف نہایت دشوار ہی نہیں بلکہ بسا اوقات ناقابل حل نفسیاتی
المحجنوں کا حامل بھی ہوتا ہے، خود میں اپنی زندگی کے کئی ایسے لمحے گن سکتا ہوں جب
میں نے اپنے آپ کو بالکل پاگل متصور کیا ہے اور بار بار سڑک پر چلتے ہوئے میں نے اکثر

تشریف آجینیوں کو مسکرا مسکرا کر اپنے آپ سے باتیں کرتے سنا ہے، یا چھڑی کو اس طرح زور زور سے تہیدیری انداز میں ہلانے ہوئے دیکھا ہے گویا کسی غیبی دشمن کے حملوں کا جواب دیا جا رہا ہے اس وقت شب سے اتنی درستی اور بربریت کا اظہار ہوتا ہے کہ چوک میں کھڑا بو آلوپس کا سپا ہی بھی مشتبه نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر دل میں سوچتا ہے کہ کہیں یہ وہی پاگل خانہ سے بھاگا ہوا سوداگر تو نہیں جس کا حلیہ میری ڈائری میں محفوظ ہے۔

چنانچہ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ایک باڈے اور ہشتند کتے کی پہچان کافی مشکل ہے کم از کم عام انسانوں کے لئے ایک ڈاکٹر بھی تو کافی دیر کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ کتا پاگل تھا کہ نہیں اور اس دنیا میں ہر آدمی ڈاکٹر یا پاگل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بازار میں چلتے چلتے کتے نے مجھے کاٹ لیا، تو میں حیران سا رہ گیا اور پہلے چند لمحوں میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بات یوں ہوئی کہ وہ شام ذرا غیر معمولی طور پر خشک تھی اور بڑے بازار میں بھی غیر معمولی رونق تھی میں ایک بڑا بھورا کوٹ لپیٹے ہوئے بڑے مزے سے سگریٹ کے کش لگاتا ہوا جا رہا تھا کہ یکایک — جیسے قصے کہانیوں میں اکثر ہوتا ہے — کسی کتے نے پیچھے سے آکر میری ٹانگ کو دوپچ لیا، ہاں خوب یاد آیا، داتنی ٹانگ تھی اور میں گرم تیلون پہنے ہوئے تھا، کتے نے پہلے تو اپنے تیز دانتوں سے تیلون کو پارہ پارہ کیا پھر بڑھ کر گوشت پر بھی — جیسا کہ قصے کہانیوں میں اکثر لکھا جاتا ہے — "محبت کی ایک مہر ثبت کر دی اور یہ سب کچھ اتنی بھرتی اور خاموشی سے ہوا کہ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ دوسرے لمحہ میں دیکھا تو کتا نظر سے غائب یا منظر العجائب!

اگلے چند ثانیے اسی پوکھلا سہٹ میں گزر گئے، اس کے بعد خیال آیا کہ کتنے کا بیچا کر دیا
اور اسے پکڑ کر اور مار مار کر اس کا کچھ نکال دوں، ادھر دیکھا، ادھر دیکھا، شاید وہ اس موڑ کے
پرے زرخین داس کی دکان کے قریب گھوم گیا تھا مگر کدھر بہ پھر نینکوں کے لٹکتے ہوئے ٹکڑوں
کی طرف دیکھا اور اپنے درزی کے ہاں جانے کی صلاح کی، آخر بجائی کی سی سرعت کے ساتھ
خیال آیا کہ اگر کتنا پاگل ہوا تو —

نتیجہ یہ ہوا کہ میں رام بھیجامل انگریزی دوا فروش کی دکان پر پہنچا اور اس سے جلد جلد
چند ٹوٹے چھوٹے جملوں میں زخم پر دوا لگانے کو کہا۔ اُس نے فوراً ایک تیز قسم کا کاربالک اسپت
لگایا۔ پھر زخم پر پیٹی باندھ دی اور میرے مُنہ میں ایک سفید سفوف سا پھینک کر کہا "لو اب
دو گھونٹ گرم پانی کے پیو، کل بڑے ہسپتال چلے جانا اور ٹیکہ لگوانا، دیکھو ضرور"
میں دو دن متواتر غور کرتا رہا کہ بڑے ہسپتال جا کر ٹیکہ لگوانا مفید بھی ہو گا؟ چند دوستوں
نے مشورہ دیا، اسے میاں اُجھانے دو، اول تو آج کل سردیوں کے دنوں میں کتے سرے سے
پاگل ہوتے ہی نہیں اور اگر کوئی خدا نخواستہ پاگل ہوا بھی تو اسے بڑے بازار میں کون پھرنے
دے گا، پھر ٹیکہ لگوانا تو ایک بہت بڑی زحمت ہے، کیا تم نے اسے آسان سمجھ رکھا ہے۔
سارا پیٹ سو ج جائیگا، ہمارے ہاں ساتھ کی کوٹھی میں ایک بوڑھے وکیل رہتے تھے، ان کے
کتے نے ایک دن انہیں کھیلتے کھیلتے کاٹ کھایا تھا، بوڑھے وکیل صاحب نے پہلے تو کتے کو
گولی کا نشانہ بنایا اور پھر وہ ہسپتال میں ٹیکہ لگواتے پھرے، سارا پیٹ سو ج گیا تھا، چھ
ہفتہ بستر پر پڑے۔ آخر بڑھے آدمی تھے مر گئے۔

بعض احباب نے کہا، کیا واسیات ہے ٹیکہ لگوانے پھر وگے، جانے دو میاں جانے دو
لال مچیں اور سر مہ پیکر زخم پر لگایا کرو، چند دنوں میں آپ ہی آپ زخم سے سارا زہر
رِس رِس کر بہ جائیگا۔ بھلا جب ہمارے ملک میں ٹیکہ کا رواج نہ تھا تو کیا اُس وقت اور
کوئی نشانی علاج نہ تھا، او نہ۔

امجد نے کہا، جی میں تو کھری کھری کہوں گا چاہے کوئی ناراض ہی ہو جائے، اصل بات
تو یہ ہے کہ یہ بہت ہی نامراد مرض ہے، جب اس مرض کی سب علامات ظاہر ہو جائیں تو
پھر بعض کبھی نہیں بچتا، ارے اس کا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔ دراصل یہ ضربِ اِشَل تو
باتوں کے کنڈوں پر صادق آتی ہے، نہ کہ بچا رے سانپوں پر، ہمارے محلے میں ایک نوجوان کو
کتے نے کاٹ کھایا تھا، بچا راپنی ماں کا اکڑتا بیٹھا تھا، دس پندرہ روز یوں ہی ہلدی پیاز
لگاتا رہا، پندرہ سو برس روز اسے یکا یک بخار اور بدنہ بیان ہو گیا، خدا کی قسم بستر میں پڑا پڑا اچھٹ تک
اچھل اچھل جاتا، میرے اُندھ لٹنا مودی مرض ہے، آدمی ہوا کا ایک جھونکا تک نہیں سہ سکتا
سارا بدن کانپتا ہے اور پانی، ... پانی تو مطلق نہیں پی سکتا، ... دوسرے دن بچا راس
دوبلے سے کوچ کر گیا، یہ کہہ کر امجد نے اپنی آنکھیں اوپر چڑھائیں اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

امجد کے اس بیان نے کہ وہ بچا ر اچھٹ تک اچھل اچھل کر جاتا تھا "مجھ پر بہت
اثر کیا، میں نے تصویریں دیکھا کہ میں بدنہ بیان میں پڑا ہوں اور چھت تک اچھل اچھل کر سر سے
ٹکریں لگاؤ ہوں، گھروں لے، احباب، دوست، بیوی، بچے سب روکتے ہیں مگر میں کسی کے
قابو میں نہیں آتا، اب سر سے خون جاری ہو گیا ہے، اب بھیجا بھی باہر نکل آیا ہے،

میری بیوی سر سیٹ رہی ہوگی، بڑا لڑکا میرے پاؤں پکڑے ہوئے رو رہا ہے، لوگ میرے جنازہ کو جا رہے ہیں یہ میری قبر ہے، مر رہی ہوں پر سیاہ حروف میں اُستاد ذوق کا شعر لکھا ہے:

سگ فینا پس از مردن بھی دانگیر دنیا ہو
 کہ اس کتنے کی مٹی سے کتنا گھاس پیدا ہو

انتے ہیں امجد نے آنکھیں جھکا کر میری طرف دیکھا، ہاں، میاں، ضرور کل بٹے ہسپتال جا کر ٹیکہ لگوانا، کوئی ہنسی نہیں ہے، زندگی اور موت کا سوال ہے۔

بڑے ہسپتال جا کر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ مفلس و نادار کتوں کی جماعت کس طرح نزع انسان سے بدلہ لے رہی ہے، کتے وہی باولے ہوتے ہیں جو اکثر بھوکے رہیں جن کا مالک کوئی نہ ہو، جنہیں ہر جگہ سے دھکا رہا جائے، اگر میوں میں کوئی پانی پینے کو نہ دے، سڑیوں میں کسی مکان کے گرم کوشے میں پناہ نہ مل سکے، جسم پر خارش نکل آئے تو کہیں سے کوئی دوا دستیاب نہ ہو، اس حالت میں اگر دماغ چل جائے تو کیا عجب ہے، اگر وہ سوسائٹی سے بدلہ لینے پرنیل نہ جائیں تو اور کیا کریں۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ چلے وہ کتنا پاگل ہو چاہے نہ ہو اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ مجھے کاٹ کر وہ غیر شعوری طور پر انسانی سوسائٹی کے خلاف جس نے اس کی جنس کو غلام بنادیا تھا۔ پُر زور آواز بلند کر رہا تھا۔ غلامی میں ہمیشہ چند افراد ہی خوش ہوتے ہیں۔ ورنہ اکثریت تو ہمیشہ بازاروں میں بھیک مانگتی دکھائی دیتی ہے بچائے کتے! ایک بڑے کے پاس پر حیا لکھی جا رہی تھیں اور سگ گزیدہ لوگوں کی اتنی بھڑکتی

کہ میں نے سمجھا کہ میں بھول کر کسی الیکشن کمپ میں گھس آیا ہوں مگر پھر فوراً ہی اطمینان ہو گیا جب
میں نے میز پر پڑے ہوئے ایک صوتی آلہ کو دیکھا کہ جس سے ڈاکٹر لوگ مریضوں کی چھاتی ٹھونکا
کرتے ہیں، کترسی پر بیچہ کہ پرچی لکھائی۔ آپ کا نام، پتہ، ذات، انکم ٹیکس، یہ سب سوال اتنی
جلدی سے کئے گئے کہ مجھے پھر شک ہو گیا کہ ہونہ ہو، یہاں دوڑوں کی پرچیاں بنائی جا رہی
ہیں جلدی میں اٹھ کھڑا ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فوراً پرچی ہاتھ میں دے کر کہا۔ دوسرے کمرے
میں ٹیکہ لگو ایسے، ادھر سے جلیے۔ آداب عرض، آداب عرض۔

دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا، باہر راتے میں دو تین سو کے قریب آدمی بیٹھے ہو
تھے، دور دور سے لوگ آتے ہوئے تھے، غریب زمیندار، میلی پگڑیاں اور کالے تہمد باندھ
ہوئے، کسی کی بغل میں بچہ، کسی کے کاندھے پر چھوٹا سا بستر، ڈاڑھیاں خاک آلودہ، مسکین پامال
سے پہرے جیسے کسی نے ٹھوکر مارا کر مسخ کر دیئے ہوں، بوڑھی عورتیں روتے چلاتے ہوئے ننگے
بچے، کوئی فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا، کوئی سامنے سبز سبز کپڑوں میں لیٹا ہوا کراہ رہا تھا، کراہ
کچھ توقف کے بعد کھلتا چیرا سی پرچی پر سے نام پڑھ کر دوسرے آواز دیتا جیسے عدالت میں پیشی
ہوتی ہے، کوئی لٹھی ٹیکتا ہوا جاٹ اندر داخل ہو جاتا، اور پھر دروازہ کھٹ سے بند ہو جاتا
مجھے کسی نے بتایا، آج آپ کی باری نہیں آئے گی اور اگر آئے گی بھی تو بہت دیر سے، اگر کل
آپ صبح کو آئیں اور دوسرے دروازے سے جو اس وارڈ کے دوسری طرف کھلتا ہے۔
اس طرف سے داخل ہوں، وہ — میرے خیال میں وہ بہتر رہے گا۔

دوسرے دن صبح ہی اٹھ کر گیا، ابھی ڈاکٹر صاحب تشریف نہ لائے تھے۔ کمرے میں

ایک چیرسی آگ تپ رہا تھا۔ ایک کمپونڈر ٹیکہ کی پچکاریوں کو سپرٹ سے صاف کر رہا تھا۔ چھوٹا ڈاکٹر یعنی ڈاکٹر کانائب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رتبڑ پر کچھ دسج کر رہا تھا۔
میں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب ابھی نہیں آئے۔"

کمپونڈر نے جواب دیا۔ "دو اندھڑوں کے کمرہ میں ٹیکے لگا رہے ہیں۔"
کچھ توقف کے بعد کمپونڈر نے چھوٹے ڈاکٹر سے نہایت مسکین لہجہ میں کہا۔ "جی آج میرے چھوٹے لڑکے کو بخار چڑھے ہوئے پندرھواں روز ہے۔"

"ہو نہہ! پندرھواں روز؟" ڈاکٹر نے فلم چھوڑ کر ٹھٹھتے ہوئے کہا۔ "کچھ مضائقہ نہیں سنبھال لیں گے۔" یہ کہہ کر آپ آتشدان کے قریب ٹھٹھنے میں مشغول ہو گئے۔

چند لمحوں کے بعد آپ نے اپنی چھوٹی چھٹی آنکھیں کمپونڈر کے چہرے پر گاڑ دیں اور اس سے پوچھا۔ "اچھا تو اسے بخار ہے، خوب، لگویا کہ پندرھواں روز ہے؟ ہو نہہ!"

اس کے بعد ایک طویل خاموشی چیرسی گریہ مسکین بنا ہوا آتشدان کے قریب آگ تپتا رہا، کمپونڈر پچکاریاں صاف کرتا رہا، چھوٹا ڈاکٹر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر فرش پر ٹھٹھتا رہا، اس کے ہاتھ اس کی تپوں کی جلیبوں میں تھے، آخر اس نے ہاتھ جلیبوں سے نکال لئے اور داتیں ہاتھ کی چنگلیا کو دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھ کر کہنے لگا۔ "بخار؟ پندرھواں روز۔ کیا کھانسی بھی ہوتی ہے؟"

"جی نہیں۔" کمپونڈر نے سپرٹ لیمپ جلاتے ہوئے جواب دیا۔
"ڈاکٹر کی جلیبوں میں آگ لگتی ہے، بات ہے بخار کے رات کو کھانسی بھی نہیں

ڈاکٹر بولا "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے منوینا نہیں۔"

"جی، بالکل نہیں" کمپنڈرنے ٹیکہ کی ٹیوبوں (TUBES) کو گنتے ہوئے جواب دیا۔
 "ایک دو تین چار بالکل نہیں، بات اصل میں یہ ہے کہ بڑے ڈاکٹر صاحب نے اُسے دیکھا تھا۔
 کہنے لگے اسے تپ محرقہ ہے، ڈیڑھ ماہ کے بعد بخار اترے گا، دوائی بھی دہی دیتے ہیں،
 میں آپسے گزارش کرنے والا تھا کہ"

چھوٹے ڈاکٹر نے جلدی سے کہا "ٹھیک، ٹھیک میں سمجھ گیا، آخر ہو سکتا ہے، بڑے بڑے
 ڈاکٹروں سے بھی تشخیص میں غلطی ہو جاتی ہے، میں خود اُسے چل کر دیکھ لوں گا۔"
 کمپنڈرنے کہا "آپ کی بہت نوازش ہوگی، اگر مگر میرا مطلب یہ تھا کہ گو بڑے ڈاکٹر بہت
 مہربان ہیں، پھر بھی — بات یہ ہے کہ میں چاہتا تھا کہ آپ بڑے ڈاکٹر صاحب سے میرے
 متعلق سفارش کر دیں۔ میں تین چار روز کی چھٹی چاہتا ہوں، لڑکا سخت بیمار ہے، لکھ رہا ہے
 بیوی بھی گھبراتی ہوئی ہے اور —"

"اوہ —" ڈاکٹر نے رنجیدہ ہو کر کہا "اوہ مگر ہاں، ہاں، مگر جی، معاف کرنا،
 جب بڑے ڈاکٹر صاحب کو خود تمہارے لڑکے کی بیماری کا علم ہے تم خود انہیں سے چھٹی مانگ لو
 اور نسخہ بھی تو انہیں کہے، میں کیسے سفارش کر سکتا ہوں!"
 کمپنڈرنے سر جھکا لیا، ڈاکٹر ٹہلنے لگا۔

اتنے میں ایک دروازہ کھلا، اور بڑے ڈاکٹر صاحب داخل ہوئے، اُن کی مسکراہٹ
 ہی سے مترشح ہوتا تھا کہ یہی بڑے ڈاکٹر ہیں اُنکے پیچھے پیچھے ایک نرس داخل ہوئی۔ میں

نے ٹوپی اٹھا کر اس صبح سلام کیا کہ دونوں خوش ہو جائیں، دونوں خوش ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا: "یہ پرچی ہے، مگر آپ کل نہیں آئے؟"

زس نے کہا: "مگر زخم تو تھوڑا سا ہے۔ یہ تو جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں" ڈاکٹر صاحب نے کہا: "زخم گوانا گہرا نہیں، پھر بھی ٹیکے تو آپ کو پورے چودہ

روز لگوانے پڑیں گے۔"

"صرف چودہ روز! میں نے زس کے سرخ اور چمکیلے لبوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

زس مسکرا دی، بڑے ڈاکٹر سنس کر چھوٹے ڈاکٹر سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے، چھوٹا

ڈاکٹر کہہ رہا تھا: "ہاں جناب میں ابھی ابھی کمپونڈر — کہہ رہا تھا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب کا

نسخہ بہت ہی اعلیٰ ہے اور جناب تشخیص اس عمدگی سے کرتے ہیں کہ مرض کو جڑ سے پکڑ لیتے

ہیں، جی ہاں، بالکل ٹھیک تیپ محرقہ کے سوا اور کیا ہوگا، جی، بالکل ٹھیک، بجا فرمایا آپ

نے، یہ چھپی لے کر کیا کرے گا، یہاں آگے ہی کیا تھوڑا کام ہے، انہیں چار سو روپیوں کو

روز دیکھنا پڑتا ہے۔"

اتنے میں دروازہ کھولا، اور نیلی وردی پہنے ہوئے ایک چیراسی اندر داخل ہوا اور

بڑے ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کہنے لگا: "حضور کو بڑے ڈاکٹر صاحب یاد کرتے ہیں"

جب بڑے ڈاکٹر چلے گئے تو میں سوچنے لگا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ اس دورِ مہاجری میں

ہر کوئی دوسرے سے بڑا ہے، چھوٹا ڈاکٹر، بڑا ڈاکٹر اور پھر اس سے بھی بڑا ڈاکٹر کیا انسانو

کی غلامی کی وجہ پر پہنچ کر ختم نہیں ہوتی کتنی عجیب بات ہے، زندگی کے ہر شعبے

میں —

نرس بولی (انگریزی میں) "تم بڑے شریر ہو۔"
 'میں نے کہا (انگریزی میں) "میں بالکل معصوم ہوں، مجھے باؤلے کتے نے کاٹ
 کھایا ہے، میں دکھ کا مارا ہوں۔"

نرس نے منک کر کہا۔ میں ان معصوم شرارتوں کو خوب سمجھتی ہوں، اچھی طرح سے۔
 میں نے کہا "تم بہت خوبصورت ہو، لو اب تو سچا چھوڑو، یہی بات تم میرے منہ
 کہلوانا چاہتی تھیں نا۔"

نرس بالکل جھوٹ، میں تمہاری چالوں کو خوب سمجھتی ہوں" یہ کہہ کر وہ میز کے قریب گئی
 اور پچکار یوں میں دو ابھرنے لگی۔

میں نے نرس سے پوچھا "بھلا، یہ تو بتاؤ، اگر ایک فخر پرے ٹیکے لگوائے جائیں،
 تو اگر پھر کوئی کتا کاٹ لے تو کیا اس صورت میں دوبارہ ٹیکے — میں نے فقرہ
 نامتام چھوڑ دیا۔

نرس۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ مجھے تم نیک آدمی معلوم ہوتے ہو، کیا تم سارے شہر کے باؤلے
 کتوں سے اپنے آپ کو کٹوانے پر تیار ہو؟
 میں۔ یہ میں نے کب کہا ہے؟

نرس۔ تو پھر —؟

میں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ آخر تمہارا بھی کوئی کتا ہوگا۔

نرس۔ ہے، مگر وہ تمہاری طرح بات لا نہیں۔

میں (چھینپ کر) اس کا نام کیا ہے؟

نرس۔ ٹیڈی

میں۔ کتنا جھوٹا سا نام ہے۔ تمہیں نام رکھنے کا سلیقہ تو ہونا چاہئے۔

نرس۔ شٹ آپ

پھر فوراً سنس پڑی، کہنے لگی۔ اپنی پرچی دکھاؤ، کتنی دوائی بھرنی ہے۔ پانچ سی سی

(CC) کہ سات؟

بڑے ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے (اب انہیں منجھلے ڈاکٹر صاحب کہا جائے تو

نیا دہ موزول ہوگا) کہنے لگے۔ ”آئیے آپ کو ٹیکہ لگا دیں۔ ایک چنگی میں سلیبیوں کے قریب

پچکاری کی سوئی گھونپ دی اور کہنے لگے۔ ”آپ کو تکلیف تو نہیں ہوتی؟“

میں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ نرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور فوراً

جواب دیا۔ ”مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب!“

ڈاکٹر صاحب نے پیٹ سے سوئی نکالتے ہوئے کہا۔ ”اور...“ میرا خیال ہے

(کمپونڈر سے مخاطب ہو کر) تم نے پچکار ہی ہیں دوائی نہیں بھری، کیوں؟

”جی“ کمپونڈر نے پچکپاتے ہوئے کہا۔ ”جی، مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں شاید“

نرس جلدی سے بولی۔ ”تو کوئی حرج نہیں۔ انہیں تکلیف تو مطلق ہوتی نہیں،“

دوسری پچکاری کر دیجئے۔“

ڈاکٹر نے کہا : "ہاں یہ درست ہے"

دوسرے انجکشن کے بعد —

میں نے ٹوپی اٹھائی اور کہا : "گڈ مارننگ ڈاکٹر صاحب" (نرس کو) "گڈ مارننگ"
 ڈاکٹر صاحب (موٹی اور تھکی ہوئی آواز میں) "گڈ مارننگ"
 نرس "گڈ ما — رنگ"

اُس کی آواز تپتی اور باریک تھی جیسے دوائی پینے کے بلوریں گلاس کے ساتھ ایک
 نفرتی چمچہ نکر جاتے۔

کمرے سے نکل کر میں بڑے بڑے برآمدوں میں سے گزرتا ہوا ہسپتال کے اس علیشا
 ایوان میں پہنچا جس کے اوپر نیلے کلسوں والے گنبد کھڑے ہیں اور چاروں دواؤں پر نیلی
 دندیوں والے خدمتگار ایستادہ ہیں، اسی ایوان کی خوبصورت منقش چھت کے نیچے بڑھا کسان
 اور اُس کی بیوی چھوٹے ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑے ہوئے واپس جانا کا رایہ مانگ رہے تھے۔
 چھوٹے ڈاکٹر نے ترشرد ہو کر کہا : "مگر ایک دفعہ جو کہہ دیا کہ تمہارے کاغذات
 ڈاکٹر صاحب کو بھیج دیجیے ہیں تمہیں واپسی کا کارایہ مل جائیگا۔"

بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا : "صاحب اب ہم یہاں بالکل نادائق ہیں، ہم
 ہر گئی سے آئے ہیں یہاں ہاں لا کون واقف ہے، ہر گئی میں صاحب نے کہا تھا کہ واپس جانے
 کا کارایہ یہاں سے مل جائیگا۔ جو دو دن ہم میاں بیوی سرکار آپ کے سہارے ہی یہاں پر رہے

ٹیکے لگواتے رہے ہیں۔ اب واپس جانے کا کرایہ بھی آپ سے ہی مل جائے تو حضور کو دعا پڑھیں دیں گے۔

ڈاکٹر نے جواب دیا: ”مگر بھائی کرایہ اتنی جلد ہی نہیں کہاں سے دے دیں، ہم نے تمہارے کاغذات کا کٹر صاحب کو بھیج دیا ہے۔“

”سرکار! کسان نے کہا: ہم آج رات کو کہاں رہیں گے، رٹی کہاں سے کھائیں گے ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ تمہارے کہا تھا کہ یہاں سے واپس جانے کا کرایہ مل جائیگا اور۔۔۔“

ڈاکٹر جلدی سے بولا: ”پھر رٹی کرایہ، کرایہ، کرایہ، ایک دفعہ جو کہہ دیا۔ اتنا کہہ کر وہ چلے لگا۔ مجھے ویجھ کر اس کی بشارت ہو کر آئی، ہنس کر کہنے لگا: آپ نے ٹیکہ لگوا لیا۔ بہت اچھا کیا، اب آپ کل تشریف لائیں گے نا، اچھا، اچھا، گڈ مارننگ۔“

”گڈ مارننگ“

میں جب ایوان سے باہر نکلا تو کسان کی بیوی اپنی دھری کر پر ہاتھ رکھے پوچھے منہ سے ایک دروازے پر کھڑی، خدمتگار سے پوچھ رہی تھی: ”کیوں بیٹا، کچھری کدھر ہے؟“

بات میں سے بات نکل آتی ہے، اُسی شام کو بڑے بازار کے چوک کے قریب میں ایک بوڑھے آدمی اور بوڑھی عورت کو بھیک مانگتے دیکھا۔ میں اپنی دھن میں مصروف تھا چلا جا رہا تھا کہ معاً کسی نے سامنے سے دو ہاتھ پھیلا دیئے۔

بابا، بابا، ایک پیسہ،

دو پر شکن پھیلیاں کانپ رہی تھیں، میں نے نگاہ اٹھائی، یہ وہی بوڑھا کسان تھا جو لاٹھی ٹیکتا ہوا اپنی بیوی کو سہارا دیتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آہ، یہ دو غریب معصوم سی روحیں کیوں اس مکرو فریب کی دنیا میں گھوم رہی تھیں انکبت ویاس کے دو ٹپتے ہوئے مرقعے تھے۔ ان کے لب بھیک مانگتے مانگتے سوکھ گئے تھے اور وہ اپنے کھیتوں سے بہت دور اس پردیس میں اکیلے تھے۔ بوڑھے کسان کی لرزتی ہوئی آوازیں نظر نہ آنے والے آنسوؤں کا نم تھا اور وہ غریب عورت کسی صدیوں کی مصیبت کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔

میرے دل پر چھریاں سی چل گئیں، یکایک میرے ذہن میں خیال آیا کہ غریبوں کو بھیک مانگنا اتنی آسانی سے کیوں آجاتا ہے۔ مجھے ایسا احساس ہوا کہ ان کی بدصلیبی کا میں خود ذمہ دار تھا۔ شاید، یہ میرا ہی افلاس تھا جو اس طرح دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے مجھ سے بھیک مانگ رہا تھا

بابا، پیسہ، خدا کا واسطہ، ایک پیسہ۔

میں انہیں پیسہ دینے کی بھی جرأت نہ کر سکا اور چپ چاپ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

تالاب کی حسینہ

پہاڑی کے اوپر تالاب تھا۔ یہاں سے شہر کا منظر بہت دلفریب معلوم ہوتا چھٹا سا
 خوبصورت کوہستانی شہر، اس کے مکانوں کی ٹین کی چھتیں، دھوپ میں چاندنی کے تختوں
 کی طرح چمکتی ہوئی، شوالوں کے رنگین اور پہلی کلس ہرکس جن پراوے رنگ کی بھجری بھی
 ہوئی تھی اور جن کے گرد و دریا شمشاد اور سرو کے درخت ایستادہ تھے، اُس کے باغات
 جو آڑو، پلیم اور خوبانیوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان سب مل کر اس چھوٹی سی وادی کے حسن
 کو فروزاں تر کر دیا تھا۔ شمال مغرب کے سلسلہ ہائے کوہ پر ایک ہلکی، لطیف سی دھند چھائی
 ہوئی تھی صنوبر کا دار و درلودار کے گھنے درخت اسی سپید و ہند کی چادریں لپٹے ہوئے تھے۔ پہاڑ
 کے قدموں پر ایک ٹیس کے درختوں کا ایک ڈاسا جھنڈ ایک لمبے سے کھیت پر سایہ کرتا تھا

کھیت کے درمیان ہل میں جتے ہوتے دو پہل تھے اور اتنی بلندی پر سے دو خوبصورت کھلونوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

میں نے ان دو پہلوں کی طرف دیکھتے ہوئے تالاب کے پوکیدار سے کہا: "فیروز بہت افسوس ہے، بہت ہی افسوس ہے، جب ہم نے بیخوس خبر سنی جب — ہاں، پرسوں شام کو میں ڈاکٹر ساجد کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ فیروز کا لڑکا تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ کیا بتاؤں؟ سن کر کتنا رنج ہوا، اسی وجہ سے ہم سب (اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) کل یہاں تیرنے کو نہیں آئے تھے۔ ایک دو بار جی میں آیا کہ چلو چلیں، شاید ہماری چند رسی باتوں سے تمہارے دل کو کچھ تسکین پہنچ سکے، مگر ہماری طبیعتیں ہی کچھ اس قدر افسردہ اور رنجور سی ہو گئی تھیں کہ ادھر پاؤں ہی نہ اٹھ سکے۔"

فیروز نے چنانہ کی ایک ٹہنی کا سہارا لیتے ہوئے کہا: "ٹھیک کہتے ہو بابو جی، کل میں سوچتا تھا کہ بابو جی کیوں نہیں آئے، میں غریب تو ہوں، مگر پھر بھی مجھے اُمید تھی کہ آپ ضرور افسوس ظاہر کرنے آئیں گے اور میری ڈوہارس بندھائیں گے۔"

جگمیش بولا: "بس یہی بات تھی (میری طرف اشارہ کر کے) جو انہوں نے بیان کر دی۔"

دُت نے کہا: "ہاں ہاں، بھلا نہ آنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی؟"

سرحدیت نے پوچھا: "مگر یہ ہوا کیسے؟"

فیروز نے ایک آہ بھر کر کہا: "یہ کیونکر بتاؤں کہ یہ کیسے ہوا؟ کس طرح میرا ننھا منالال اس کے لئے دیکھتے دیکھتے ہلاک ہو گیا۔ یہ ابھی تک اس امر کو سمجھ نہیں سکا کہ اس کی موت کی وجہ سے اس کی زندگی ختم ہو گئی۔"

کہ اُسے موت کیونکر آگئی، بھلا یہ بھی کوئی موت ہے، اگر اسے مرنا ہی تھا تو پہلے بیمار ہوتا، میں
 اُس کا علاج کرتا، اُسے ڈاکٹروں، ججیموں، عطائیوں، پینساریوں کے پاس اٹھانے اٹھانے
 پھرتا، اُن سے ہاتھ باندھ کر عرض کرتا، خدا را میرے بچے کا اچھی طرح علاج کر۔ ہم دونوں
 میاں بیوی بیماری کی راتیں جاگ جاگ کر کاٹنے زسار اداں اُس کے سر لے بیٹھے رہتے، اُسکی
 ذرا ذرا سی فرمائش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے، وہ کتنے ہی دنوں سے رُڑکا کھلونا مانگ رہا
 تھا۔ ہائے میں نے اُسے کیوں نہ لا کر دیا۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگلی تنخواہ کے آنے
 پر تجھے لے دوں گا۔ کیا پتہ تھا کہ جب اگلی تنخواہ آئے گی۔ میرا بٹیا کھلونا مانگنے کے لئے یہاں موجود
 نہ ہوگا، دل چاہتا ہے، میں وہ رُڑکا کھلونا جو اسے اس قدر پسند تھا خرید لوں اور اپنے
 بیٹے کی قبر پر چاکر رکھ دوں اور اُس سے کہوں اٹھو، بیٹا منظور، تمہارا باپ تمہارے لئے
 رُڑکا پیارا سا کھلونا لایا ہے، کیا وہ میری بات نہ سُنے گا بابو جی؟
 ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ . . . ہم نے جلدی سے کپڑے اتارے
 اور غسل کا لباس پہننا شروع کر دیا۔

سرجیت بولائے کہ سال کا تھا منظور، یہی دو، ڈھائی، تین سال کا ہو گا چھوٹا سا

تو تھا ہی!

فیروز بولا، ہاں بابو جی، بس اتنی ہی عمر کا ہوگا، مگر کتنا پیارا بچہ تھا، آپ نے دیکھا تھا
 سنا لا رنگ، موٹے موٹے ہاتھ پاؤں، اُس کی ماں سعیدہ نے اُسے کتنی تکلیفوں سے پایا تھا کتنے
 ہی سروں، انہیروں سے گنڈے تعویذ لے بنتیں مانیں، تب جا کر گھر کا لال ہاتھ آیا۔ یہ پتہ نہ تھا

کہ اتنی جلدی نہیں چٹائی کا دل غمے جانیکا، بس حیرت ہے تو یہی، ایمان سے کہتا ہوں، بابو جی میرے کلچے میں بس یہی ناسور ہے، وہ بیمار ہوتا، میری آنکھوں کے سامنے کمزور ہوتا۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کی بھولی میں جان دیتا، پھر میں اسے کھاتا، دفناتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا مگر یہ کیا ہوا کہ میں یہاں (تالاب کے عین اوپر ایک مکان کی طرف اشارہ کیسے) اپنے مکان کے صحن میں کھڑا اور نیچے پگڈنڈی پر جاتے ہوتے ان خوش باش بھنگہر جو انوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو گانے، ناچتے ہوتے بساکھی کے میلہ پر جا رہے تھے، یہاں تالاب میں غربی سمت پر چند مکھ لڑکے نہا رہے تھے، اودھو دوسری طرف چند عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں منظور کی ماں سعیدہ صحن میں چوٹھے پر کھلی کی روٹیاں پکا رہی تھی منظور اُسی کے پاس کھڑا تو ملی آواز میں کہہ رہا تھا، اماں آئی، اماں اوتی، سعیدہ کی ماں کھاٹ پر بیٹھی چائے پی رہی تھی، پھر پتہ نہیں کس وقت منظور اپنی اماں کے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا، کپڑے دھوتی ہوئی عورتوں کو چھپا چھپا نہاتے ہوئے سکھ لڑکوں کے قہقہے، بساکھی کے میلہ کو جاتے ہوئے ہارنوں کا شور غل بس ہم نے ان چند منٹ کے لئے منظور کو اپنے دل سے بھلا دیا، کچھ دیر کے بعد میں نے تالاب کے کنارے سے کسی کو کہتے سنا، وہ لکڑی سی کیسی تیر رہی ہے، اس کے بعد اُسے بھڑ... یہ تو کسی کی لات ہے۔ پھر کسی نے کہا، بچہ! میں بھاگتا ہوں اُگنا اُسے کی طرف گیا۔ کسی نے ہاتھ پاؤں چھو کر کہا، مر گیا، (چھاتی پر دو ہتھ مار کر)، ہائے!!

جگدیش۔ صبر کرو فیروز صبر کرو!

فیروز۔ بابو جی صبر کرو تو کیسے، آنکھوں کے آگے اس کی بھولی بھالی صورت ہے۔ اب

ہمارے لئے اس کی یاد کے سوا اور کیا رہ گیا ہے (جب میں ہاتھ ڈال دیتا ہے) اور یہاں —
 (جب سے ہاتھ نکال کر) — یہ تپلی سی مسواک۔ یہ مسواک اور ایک چھوٹی سی مٹی کی پیالی، میں
 نے یہ دونوں چیزیں اُس چھوٹی سی نہر کے کنارے پائیں جو اس تالاب کو پانی مہیا کرتی ہے
 وہ صحن سے اتر کر نہر کی ان بیڑھیوں کی طرف آیا ہوگا۔ آہستہ آہستہ اُس نے جھک کر مٹی
 کی پیالی میں پانی بھرا ہوگا۔ مسواک کو زمین پر رکھ کر اُس نے نہر میں ہاتھ ڈال کر پانی سے
 کلی کرنے کی کوشش کی ہوگی، پھر وہ یکایک پھسل گیا ہوگا، پانی میں ہلکا سا شور بھی پیدا
 ہوا ہوگا، اُس نے چغینے کی کوشش بھی کی ہوگی۔ تالاب کے کنارے تک جاتے جاتے
 اُس نے ہاتھ پاؤں بھی ماسے ہوں گے۔ مگر آدھ میری آنکھوں نے کچھ نہ دیکھا، نہ کانوں نے
 سنا، سوا ان گیتوں کے جو راگ گیر گارہے تھے، سعیدہ روٹی پکاتی رہی، بڑی اماں کھاٹا پیر
 چائے پیتی رہیں اور اس نہر کے کنارے ہماری آنکھوں کے سامنے ... ہائے ...

ہائے، بابو جی، صبر کیسے آئے؟
 سرسجیت۔ ہمیشہ ایزدی مٹی، اس میں کسی کا کیا دخل، خدا نے تمہیں دیا، اسی نے لے
 لیا۔ تمہارا اس پر اتنا ہی حق تھا۔

فیروز۔ سچ ہے بابو جی، انسان کیا کر سکتا ہے؟
 دت۔ کیسا پیارا بچہ تھا، جگہ لیش، تمہیں یاد ہے وہ دن، وہ اس نہر کے کنارے اپنی
 چھوٹی سی قمیص دھو رہا تھا، کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا، یاد ہے، میں نے تم سے کہا تھا، اس کو
 کیمرہ ہوتا تو اس کی تصویر کھینچ لیتے اور انعامی مقابلے کے لئے بھیجتے۔

سعیدہ جواب تک پاس کھڑی چپ چاپ سب بانیں سن رہی تھی اور انچل سے
 آنسو پھپھتی جاتی تھی۔ بھڑائی ہوئی آواز میں بولی: "بالو جی، کنزروک نانڈ سنگھ جی جو ڈاک بیگلے
 کے قریب ایک کوٹھی میں رہتے ہیں انہوں نے ایک بار منظور کی تصویر دیکھی تھی ہم نے کئی بار
 ان سے وہ تصویر مانگی ہے مگر وہ دیتے نہیں اگر آپ ان سے کہیں تو۔۔۔"

جگدیش بولا: بہت اچھا سعیدہ، میں ضرور ان سے کہوں گا، امید ہے وہ تصویر
 دے دیں گے۔

اب ہم سب غسل کا لباس پہن کر تالاب کے کنارے پر پہنچ چکے تھے تالاب کی وسیع
 چادر آب ہمارے سامنے تھی جس پر کہیں کہیں نیلو فر کے پھول کھلے ہوئے تھے، میں ہاتھ پھیل کر
 ایڑیاں اٹھا کر غوطہ زن ہونے کو تھا کہ سر جھٹکے آہستہ سے میرے کان میں انگریزی زبان
 میں کہا: "سیچھے دیکھو!"

میں نے مڑ کر دیکھا، چنار کے درخت کے قریب، جنگلی گلاب کی سیلوں کے درمیان
 ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سرو کی طرح خوش قامت اور جنگلی گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت
 اور نازک اندام، اس کی دونوں کلاسیاں اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور سر پہ رکھی ہوئی مٹی کی
 گاکر کو تھامے ہوئے تھیں۔ سعیداس کے پاس کھڑی اشاروں میں اسے کچھ کہہ رہی تھی
 دھکتی نازک کتنی خوبصورت تھی۔ بانٹے، ترچھے، دلاؤیز نقش، کیا ایک عورت بھی اس قدر
 حسین ہو سکتی ہے۔ مجھے احساس ہوا: یہ عورت نہیں جیتانی کی ایک تصویر ہے۔

میں نے سر جیت سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

سر جیت نے استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا: "تم نہیں جانتے، یہ کون ہے، میرے
یہ ایک کہاری ہے اور پرے تالاب کے اُس پار (انگلی سے اشارہ کر کے) وہ جو گھر ہے نا
کچا سا، وہاں رہتی ہے، سب جج صاحب کا لڑکا جو یہاں نہانے کیلئے آیا کرتا ہے، اُس
نے اِس کا نام تالاب کی حسینہ رکھ دیا ہے۔"

"تالاب کی حسینہ تالاب کی حسینہ" میں نے دہراتے ہوئے کہا
"اچھا تو یہ سعیدہ اسے کیسے اشارے کر رہی ہے۔"

"پجاری غریب لڑکی گونگی ہے نا۔"

"اوہ۔" میں نے آہستہ سے کہا: "یہ ایک میسے دل میں خیال آیا، یہ لڑکی گونگی ہے"

یہ تو بہت ہی اچھا ہے، کیا کسی نے چٹائی کی تصویر کو بولتے دیکھا ہے، اگر تصویر، خاموش تصویر
بول اُٹھے، تو اُس کی ادھی شعریت، رنگینی اور سحر پروری فنا ہو جائے، کاش دنیا کی تمام
حسین عورتیں گونگی ہوتیں۔"

ہم سب کی نظریں اپنی طرف گڑی دیکھ کر وہ لڑکی حیران سی ہو گئی، اُس نے اپنی بڑی
بڑی وحشی ہرنبوں والی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا، وہ گھبرا کر ٹھٹھک سی گئی، اُس نے
اپنا رخ ہماری طرف سے پھیر لیا۔ کانوں میں بڑے ہوتے مورتیا کے آؤنیے کا ایک سونج کی
کرنوں میں چمک اٹھے، اُس نے سعیدہ کی طرف دیکھ کر سر کو ایک خفیف سی جنبش دی، مٹی کی
گاڑی میں ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا۔ پاؤں کی جھانجھان سے لگیں، ساکن تصویر میں زندگی

کی لہر دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر سے نیچے اترنے لگی۔

میں نے بیکام کہا: تم جانتے ہو سر جیت! ہندوستانی رقص کی ایجاد کیسے ہوئی؟
”نہیں، کیوں؟“

میں نے پگڈنڈی پر سے نیچے اترتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”وہ دیکھو!
ایک مٹی کی گاگر اٹھائے ہوئے دو شیر، اور ٹخنوں پر بستی ہوئی روپہلی جھانجھیں یہی ہندوستانی
رقص کی ابتدا اور انتہا ہے!“

جگدیش نے ہنستے ہوئے کہا: ”میرا خیال ہے تم اس غریب لڑکی کو نگاہوں سے نکل
جاؤ گے کیسی گرسنہ لگا ہوں سے دیکھ رہے ہو، اب نہاتے بھی ہو کہ دوں میں تمہیں
پانی میں ایک غوطہ۔“

اتنا کہہ کر جگدیش نے شانے پھیلایا، اڑیاں اٹھا کر، ہوا میں ابا بیل کی طرح ایک
زقند بھری اور دوسرے لمحہ میں وہ پانی میں دھم سے غوطہ زن ہو گیا۔

اس کے بعد دھم، دھم، دھم ہم سب پانی میں کود پڑے اور فضا بلند تہ بہرہوں سے معمور
ہو گئی، سطح آب پر بازوؤں کے تیز تیز چوچرل سے تھے، ایک دوسرے پر پانی اچھا لاجا
تھا، نیلو فر کے پھول توڑ توڑ کر ایک دوسرے کی طرف پھینکے جا رہے تھے، موت بار بار منہ
میں پانی بھر کر زور سے کلیاں کرتا تھا، سر جیت کو تیرنا کم آتا تھا۔ اس لئے وہ سب کے انگ
نھاگ آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے کی مشق بہم پہنچا رہا تھا، جگدیش اس کے قریب
کہا اور اس کے سر کو اپنے بانوؤں میں تھام کر پیار سے بولا: ”ایس دفتر بے معنی (ایک ڈبلی لیکر)

غرق مے آبِ اولے " سرِ حیات چلانے لگا۔ کنارے پر فیروز کھڑا منسودہ نگاہوں سے
تالاب کے پانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فیروز کی اُداس نگاہیں میرے دل میں ایک عجیب خلش پیدا کر رہی تھیں، تیرتے
تیرتے میں نے سوچا کہ اس زندگی کے بے پایاں تالاب میں ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا
یہاں سنسنی کی لہریں ہیں اور موت کے پھینٹے بھی، اور پھر کبھی کبھی کئی نواں صورت
..... کہہ رہی

Handwritten text in a script, likely Kashmiri, at the top of the page. The text is faint and mostly illegible due to fading and bleed-through.

Handwritten text in a script, likely Kashmiri, in the middle of the page. The text is faint and mostly illegible due to fading and bleed-through.

ہنگی

مسافر نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، آسمان کے گہرے نیلے سمندر میں بادلوں
 کے سفید سفید کٹے برف کے بڑے بڑے ٹودوں کی طرح تیر رہے تھے اور ان کے قریب
 چلیں منڈلا رہی تھیں چلیں بے اُس نے ہانپ کر اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا، اب
 کوئی گاؤں قریب ہی ہو گا چلیں انسانی آبادی کا نشان ہیں، اس نے دل میں سوچا
 گدھ کوئے چلیں انسان ان جانوروں کی صفات ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی
 ہیں، اسی طرح سوچتا ہوا، عالم حیوانات کی خصوصیات کے متعلق مختلف نظریے قائم کرتا
 ہوا وہ بہت سارا ستارے طے کر گیا، کئی جگہ ترچھی ڈھلانیں تھیں، کئی جگہ اونچی گھاٹیں
 تھیں جن کے دامن میں کھڑے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی چوٹیوں پر بادلوں کے

محل بنے ہیں مگر جب وہ گھاٹی کی چوٹی پر پہنچتا، تو بادلوں کا محل یکا یک اُپر اُٹھ کر آسمان میں
 معلق ہو جاتا، اس دُنیا میں کتنا دھوکا ہے مسافر کے تخیل نے اب دوسری گنڈ بڈی اختیار
 کی، ہاتھ بندھنے بھیک کہا تھا، قدرت ایک سراب ہے۔ اُس نے پھر نگاہ اُٹھا کر
 دُور آسمان میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھا۔ سپید تریاق، چمکتے ہوئے لاکھوں تلج محل
 تختے اور چاروں طرف جتنا کانپلا پانی پھیل ہوا تھا۔ اس نے سوچا، ان مہر میں محلوں کو کس
 شاہجہان نے بنایا ہے؟ اور کس محبوب کی یاد میں؟

مسافر اسی طرح اپنے دل سے باتیں کرتا ہوا بہت دُور نکل گیا، اب ہوا میں خنکی
 سی آگئی تھی اور سورج مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ سامنے پہاڑوں پر صنوبروں کے خاموش
 جنگل کھڑے تھے۔ جن کا گہرا سبز رنگ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں ہلکا بخوانی
 سا ہو رہا تھا، یہ رنگ آخر ہے کیا؟ نیلا، پیلا، سبز، بخوانی اور پھر ایک ہی قوس قزح میں
 ساتوں رنگ یا ششم کے ایک ہی قطرے میں پوری قوس قزح، عجیب بات ہے، یہ
 کیسی دُنیا ہے، میں کہاں جا رہا ہوں اور وہ گاؤں ابھی تک کیوں نہیں آیا؟

وہ کانڈھے پر پڑے ہوئے جھولے کو درست کر کے اپنی چھتری کو زمین پر ٹیک کر راستے
 میں کھڑا ہو گیا اور سرسری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ خاموشی، گہری خاموشی اُد
 پھر یکا یک گھنٹیوں کی پریشور صدا، اُسے یوں معلوم ہوا کہ لاکھوں مندر اور کلیساؤں کے
 گھنٹے ایک دم جھنجھٹا اُٹھے ہیں۔ مسافر کا خیر مقدم کرنے کے لئے ان کی آواز نے وادی کے
 خاموش طلسم کو توڑ دیا۔ یہ آواز بڑھ کر فضا میں پھیل گئی، ادھر اُٹھے ہوئے بادلوں سے ٹکراتی ہوئی

معلوم ہوئی اور پھر گھوم گھوم کر مغرب کی سمت سے آتی ہوئی معلوم ہوئی مغربی موڑ سے
بھڑوں بکریوں، گایوں، بھینسوں، مینڈھوں کا ایک ریوڑ نکل رہا تھا۔ مسافر راستہ چھوڑ
کر ایک طرف اونچے سے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔

ہا ہیش، ہلی۔ ہا ہیش، ہا ہا، نیلتی۔ ہا ہا، ہلی، ہی ہی

نیلتی اور ہلی دو خوبصورت بچھڑیاں واپس گھر جانے کی خوشی میں ہرن کی طرح
فلاں پھیں بھر رہی تھیں اور بچاری چرواہی کو انہیں ریوڑ کے ساتھ رکھنے میں بہت دقت
محسوس ہو رہی تھی۔ نیلتی کبھی بھڑوں کے گلے میں گھس جاتی اور انہیں اتار پٹیان کرتی
کہ وہ "ہے، ہا" "ہا، ہے" کرتی ہوئی تیر تیر ہو جاتیں اور سارے ریوڑ کے نظام کو جو کسی تربیت یافتہ
فوج کی مانند گی کے ساتھ چل رہا تھا توڑ دینے کی ناچستی کو دتی ہوئی بکریوں کے قریب
جاتی اور انہیں اٹھکے مار مار کر اس پاس کے ٹیلوں پر چڑھا دیتی۔ بڑی بوڑھی گائیں اور
بھینسیں نہایت اطمینان سے اور قدرے سخاوت سے مینڈھ بکھیتی جاتی تھیں، گویا کہ یہی
تھیں "کر لے، دردن اور عش" پھر وہ دن بھی آگیا جب تیری کچھلی لائوں کو باندھ کر تیرا دو
دو ہا جا لگیا، اس وقت اچھلنا، پھرتیری چال بھی ہماری طرح بے ڈھنگی ہو کر رہ جائیگی۔
اب جی بھر کر مست ہرن کی طرح فلاں پھیں بھرے۔

نیلتی اچھلتی ہوئی مسافر کے قریب آگئی، اس کے گلے میں بندھی ہوئی بھینسوں
کی خوش آواز اس کے ناپختہ ہونے قدموں کے لئے گنگاروں کا کام دے رہی تھی،
پھر اپنے اگلے پاؤں ٹیلے پر ٹیک کر وہ مسافر کے پاؤں سونگھنے لگی جیسے گل میں گھاس

کے کسی خوشے کو سونگھ رہی ہو، نیلتی، ہا! چرواہی نے اپنی تپلی آواز میں چلا کر کہا، اُس کی آواز بھی ایک گھنٹی سے مشابہت رکھتی تھی۔ حسین نیلتی نے کوئی پروا نہ کی، شاید شوخی سے ایسا شرارت سے، پجاری چرواہی کو تنگ کرنے کے لئے وہ مسافر کا بوٹ چاٹنے لگی۔

”نیلتی ہا! ہمیشہ نیلتی ہی! وہ پھر چلائی۔“

چرواہی مسافر کے بالکل قریب آگئی، اور سونٹے سے نیلتی کو سزا دینے لگی، پجاری تنگ آگئی تھی۔ چہرے پر پسینے کے قطرے تھے، اور گال بھی غصے سے تھماتے ہوئے تھے۔ نیلتی کو پرے ہٹا کر اُس نے نڈرنگاہوں سے مسافر کی طرف تاکا، ”راہی کو کو؟“ (راہی راہرو۔ کدھر جا رہے ہو) اُس نے پہاڑی زبان میں مسافر سے پوچھا۔

مسافر مسکرا دیا۔ پھر کہنے لگا۔ ”یہ نیلتی کتنی شریہ ہے؟“

چرواہی کے چہرے سے ترشی جاتی رہی، وہ نیلتی کی طرف جو کھنٹ مار کھا کر بھی جتنی بھاگتی ہوئی جا رہی تھی، پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی: ”ہاں! ابھی تین سال بھی اس کی عمر نہیں۔“

”ہم۔۔۔ اور تمہاری عمر کتنی ہے؟“

چرواہی نے ایک لمحہ کے لئے مسافر کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھا، دوسرے لمحہ میں اُس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا، اُس نے منہ پھیر لیا، اور ریوڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ گاہیوں کی پیٹھ پر ہلکے ہلکے سونٹے مار رہی تھی۔

مسافر ٹیلے سے اتر کر چرواہی کے ساتھ ہو لیا، اور اُس کا سونٹا چھین کر کہنے لگا۔

”معلوم ہوتا ہے آج تمہارا بڑا بھائی تمہارے ساتھ نہیں آیا۔ سچی تو ریوڑ چرانے میں تمہیں اتنی تکلیف ہوئی ہے۔ اب دیکھو میں ریوڑ سنبھالنا ہوں۔ ادقم ایک شریف ننھی لڑکی کی طرح میرے پیچھے چلی آؤ میں تمہکا ہونا ہوں مجھے بہت دُور جانا ہے سورج غروب ہونے کو ہے کتنی دُور ہے تمہارا گاؤں، یہ ہم داپس کدھر جا رہے ہیں“

چرواہی نے ہنستے ہوئے کہا: گاؤں تو تم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اسی لئے داپس جا رہے ہو وہ دیکھو نا، اُس گھاٹی کے قریب (انگلی اٹھا کر) وہ رہا ہمارا گاؤں“

”کیا نام ہے؟“

چرواہی نے جلدی سے جواب دیا: سارو؛

مسافر نے چرواہی کی طرف دیکھ کر کہا: ”میں کہنے کو تھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا — میرا نام انگلی ہے، (انگلی نے رکتے رکتے جواب دیا) — تم کہاں

سے آرہے ہو —؟“

مسافر نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں، زور زور سے ریوڑ کو آوازیں دینے میں مصروف ہو گیا

”ہش بابا، نیلتی با، انگلی بابا، بلی آما؛“

انگلی ہنستے ہنستے لٹ پوٹ ہو گئی، اچھا تو گویا میں بھی ایک بچھیا ہوں۔ ادھر ہو

— میں ہنستے ہنستے مر جاؤں گی۔ یہ راہی کتنا عجیب ہے ... بابا ... تم

تو ریوڑ کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے؛ ادھر لاؤ سونٹا؛“

اور چرواہی نے ہنستے ہنستے مسافر سے سونٹا چھین لیا۔

مسافر کو سارو گاؤں بہت پسند آیا، بس کوئی بیس پچیس کچے گھر تھے سپیدیٹی دکھایا
 سے لیے ہوئے ناشپاتیوں کیلوں اور سیبوں کے درختوں سے گھرے ہوئے سیب کے
 درختوں میں پھول آئے ہوتے تھے کچی سبز چھوٹی چھوٹی ناشپاتیاں لٹک رہی تھیں۔ اور
 کھیت مکی کے پودوں سے ہری مغل نے ہونے لگے کیلوں کے ایک بڑے جھنڈ کی آنکھیں
 میں گنگنا ہوا نیلا جھرنا تھا۔ اور اُس سے پرے ایک چھوٹا سا میداں تھا، جسکے وسط میں
 متوکا درخت اپنی شاخیں پھیلانے ہوئے کھڑا تھا، اُس کا سایہ اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ
 پرے اور نیچے بہتی ہوئی ندی کے کنارے تک پہنچ رہا تھا۔ ندی چھوٹی سی کسی نازک پتلی
 سی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی شمال مشرق کے برنیے پہاڑوں سے آرہی تھی اور ڈوبتے ہوئے
 آفتاب کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ نظر کے آخری نقطے پر وہ دو پہاڑوں کے نپلے کناروں
 گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جہاں اب سورج چمک رہا تھا۔ اُس کے پرے مسافر کا دیس تھا۔
 وہ وہاں کب واپس جائیگا؟ کیا وہ کبھی واپس جاسکے گا؟ یہاں کتنا سکون ہے آرام زندگی
 موت تینوں نے ملکر یہ خوشنوا وادی سی بنا ڈالی ہے۔ یکایک اُس کی آنکھوں کے آگے ریل
 گاڑی کے گھومتے ہوئے پہنچنے لگے۔ یہ کیسا شور ہے یہ انسان موت سے بھی بھگتا خاموشی
 سے کیوں اتاڑتے ہیں۔ ہر وقت شور مچاتے ہیں گلا چھاڑ چھاڑ کر چلاتے ہیں، کس لئے؟
 یہاں کتنا سکوت ہے۔ اس حسن راحت نیچے پگڈنڈی پر ندی کے کنارے سے آنکی کسی
 بے فکر ہرنی کی طرح قدم کھیتی ہوئی آرہی تھی، کاندھے پر تیلی سی سونٹی تھی، کیلوں پر ایک
 بے معنی سا گیت پادوں ننگے تھے لیکن چال پر ایک خاموش موسیقیت کا شبہ ہوتا تھا۔

مسافر نے اپنی کتاب بند کر دی اور آنگی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا، کاش وہ مصوٰر ہوتا،
 کتنی خوبصورت تصویریں کتنا دلکش پس منظر، آنگی کے ہلنے ہوئے سڈول مگر مضبوط بازو اسکی
 کمر کا متناسب خم اچھا تو وہ سنگتراش ہی ہوتا۔ دنیا میں کسی کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں، درنہ
 وہ ایک ایسا مجسمہ تیار کرتا کہ یونانی صنم اگر بھی سٹشدر رہ جاتے، اتنے میں آنگی نے
 اُسے دیکھ لیا، عجیب بات ہے، وہ کیوں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی ہے۔ اُس کے لبوں پر
 بے معنی گیت کیوں جوک گیا ہے، وہ سنوٹی سے زمین پر کیا لکھ رہی ہے، اُن پڑھ آنگی۔
 مسافر نے زور سے آواز دی: آنگی!

آنگی نے ضرور سن لیا ہے مگر اُس نے جواب کیوں نہیں دیا، وہ اب اوپر چڑھ رہی ہے
 گھاٹی کے پیچ در پیچ راستے پر سے گزرتی ہوئی ادھر آ رہی ہے، مگر اب اُس کی پال مختلف
 ہے، بازو اب بے پروائی سے نہیں ہل رہے اور گردن ایک طرف کو جھک گئی ہے، یہ ایک
 نئی تصویر ہے، ایک نیا مجسمہ ہے، وہ ٹکڑ کی دیوی تھی تو یہ دوشیزہ سمجھ رہے۔ اس مجسمہ کی تلاش
 نرالی ہے۔ اس تصویر کا رنگ نیا ہے، اس گیت کی لے افوٹھی ہے، کاش وہ منہ ہی ہوتا۔
 آنگی گھاٹی پر چڑھ آئی۔ وہ مسافر کے قریب بچھ گئی۔ اور سنوٹی کو سبز دُوب پر رکھ کر سنا
 لگی، مسافر غور سے اُس زلف کی طرف دیکھنے لگا، جو آنگی کے رخ پر اترا آئی تھی، ایک آنگی
 بول اٹھی، بزم واپس کب جاؤ گے۔ راہی! جب تم اپنا نام بھی نہیں بتاتے تو پھر میں تمہیں راہی
 ہی کہوں گی، ٹھٹک ہے نا؟

مسافر نے کتاب کے ورق اٹھتے ہوئے کہا، ٹھٹک ہے، اور راہی پھر کوئی اتنا بڑا نام بھی

نہیں بات چل میں یہ ہے انگلی کہ میں یہاں اپنی صحت کو بہتر بنانے آیا ہوں حبیب اچھا ہو جاؤں گا چلا جاؤں گا۔

انگلی نے نہایت اشتیاق سے پوچھا کہ دھڑ جاؤ گے؟
مسافر نے نہایت بے پروائی سے واسنا باز دھڑا کر کہا: "اور دھڑ جاؤں گا..."
"تم کہاں سے آئے ہو؟"

اس دفعہ مسافر نے دوسرا باز دھڑا کر کہا: "اور دھڑ سے آیا ہوں۔"
انگلی کی آنکھیں بغیر معمولی طور پر روشن ہو گئیں، رکتے رکتے کہنے لگی: "راہی تم۔"
کتنے عجیب ہو!

اور راہی دل میں سوچنے لگا: کیا واقعی میں عجیب ہوں؟ کیا میں منتظر عجیب نہیں؟ یہ خواب کی سی خاموشی، بیہوش کی سی زندگی، یہ انگلی کے رخ پر بل کھاتی ہوئی زلف، کیا یہ سب عجیب نہیں؟ انگلی کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے اور اس میں دھڑوں پیوند لگے ہیں مگر وہ کس نشان سے گردن اونچی کئے ندی کی طرت دیکھ رہی ہے۔ جس کے پانیوں کا رنگ اس کی آنکھوں کی طرح ہی نیلا ہے، کیا یہ عجیب بات نہیں؟ انگلی کے ہاتھ کتنے مضبوط نظر آتے ہیں لمبی مخروطی مضبوط انگلیاں جو ہل کی ہتھی پر زور سے جم جاتی ہوں گی، ان کلائیوں نے غالباً کبھی چوڑیوں کی کھنک نہیں سنی، کس قدر عجیب بات ہے، مگر خود میرے ہاتھوں میں نسایت کی جھلک نمایاں ہے۔ اور ایک چاقو سے اپنا قلم درست کرنے میں مجھے اتنا وقت صرف کرنے پڑتا ہے جتنا انگلی کو آدھ گھنٹہ میں بل جلانے کے لئے۔

کئی دنوں کے دفنہ کے بعد مسافر کی آنگی سے ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا۔ ”آنگی
تمہیں اتنے دنوں سے نہیں دیکھا۔“

آنگی نے جواب دیا۔ ”عجیب بات ہے میں سمجھتی ہوں کہ تم — اتنے دن کہیں غائب
رہے۔ اب... بہت دن ہوئے تم نے وہ اپنی تاروں والی منبری (والمن) نہیں سنائی
ابھی پرسوں ہی کی بات ہے ہم سب منو کے نیچے بیٹھے ہونے فیروز سے الغوزہ سن رہے تھے
تمہیں پتا ہے نا، وہ الغوزہ بہت ہی اچھا بجاتا ہے کرنا کہنے لگی، پتہ نہیں کیوں آج کل
راہی دکھائی نہیں دیتا۔ اُس سے اُس کی تاروں والی منبری بجانے کو کہتے۔ کیوں؟ اتنا
کہہ کر آنگی نے مسافر کی طرف دیکھا۔

مسافر کی انگلیاں بے چین ہو گئیں، اُس نے اپنا ہاتھ آنگی کے ہاتھ کے آساقریب کھ
دیا کہ ایک کی انگلیاں دوسرے کو چھو رہی تھیں۔ آہستہ سے بولنا نہال درست ہے میں آج
کل لمبی لمبی سیریں کرنے کے لئے گاؤں سے بہت دور نکل جاتا ہوں، کبھی کبھی اُن صنوبر
کے گھنے جنگلوں میں چلا جاتا ہوں۔“

”تمہارا کیلے جی کیسے لگتا ہوگا؟“

”اکیلا تو نہیں ہوتا، کبھی کوئی کتاب لے جاتا ہوں، کبھی کچھ لکھتا ہوں، کبھی اپنی تاروں

والی منبری بجاتا ہوں۔“

آنگی نے جیلانی سے مسافر کی طرف دیکھا، راستی تم کتنے عجیب ہو!
اُس کی سانس میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔

برسات کے آخری دنوں میں مکی کی فصل پک گئی اسارو گاؤں والے نے منہ کے
 درخت کے آس پاس بڑے بڑے کھلیان لگائے۔ مکی کے کھلیان اور پسی پسی گھاس کے
 ذخیرے منہ کے قریب ہی تین چار جگہوں پر پتی سی چھوٹی خور و گھاس کو چھیل کر گول گول
 قلعے تیار کئے۔ انہیں گوبر سے لیسپ دیا۔ پھر ان پر کھریا مٹی پھیر دی۔ اب ان میں مکی کے بھٹوں
 کے انبار جمع کئے اور ان پر بیلوں کو چکر دے دے کر چلایا تاکہ دانے بھٹوں سے الگ ہو جائیں
 کچھ بھٹے تو اس طرح سے بالکل صاف ہو گئے مگر بہت سے بھٹے سخت جان نکلے اور بیلوں کے
 پاؤں تلے روندے جا کر بھی انہوں نے مکی کے دانوں کو اپنے جسموں سے الگ نہ کیا۔
 پھر سارو گاؤں والوں کی ٹولیاں بنی۔ لوگ چاندنی راتوں کو اکٹھے ہو کر فطحوں میں بیٹھ بیٹھے
 ہیں اور بھٹوں سے دانے الگ کر رہے ہیں نیچے بہتی ہوئی ندی کا دھیمسا شور ہے ہند
 کی شاخوں میں چاند اٹک گیا ہے اور اُس اُداس نغمے کو سن رہے جو نوجوان کسان اور ان
 کی مائیں اور بہنیں اور بیویاں گارہی ہیں پھر وہ یکایک چپ ہو جاتے ہیں خاموشی سے مکی
 کے دانوں کو الگ کر رہے ہیں ابو کے نہایت ہلکے ہلکے جھونکے آتے ہیں اور منہ کا سارا درخت
 سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے کوئی آگ تپتا ہوا بڑھا کسان آہستہ سے کہہ اٹھتا ہے
 اور گاؤں بیٹو اور گاؤں پھر وہ خود ہی کوئی پرانا گیت شروع کر دیتا ہے اُسے اپنی ختم ہوتی ہوئی
 زندگی کی بہار یاد آ رہی ہے۔ زور و شعلوں کی چپک اُس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی
 آنکھوں میں لرز رہ جاتی ہے گاتے گاتے گیت کے الفاظ اُس کے منہ میں لڑکھڑاتے ہیں
 اب وہ چپ ہو جاتا ہے اور آگ کے دہکتے ہوئے کوئلوں پر مکی کا ایک بٹھا بھون رہا ہے نوجوان

چرواہیاں آپس میں سرگوشیاں کرتی ہوتی یکایک منہس پڑتی ہیں۔ نوجوان گڈریئے انہیں
 لنگھیلوں سے دیکھ کر مسکراتے ہیں پھر کوئی مہجر کا نغمہ فضا میں گونج اٹھتا ہے۔ نوجوان
 چرواہیوں کی تپتی تپتی آوازیں بھی اس میں شامل ہو جاتی تھیں، معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے
 معبد میں بیٹھے ہوئے اپنے معبود کی حمد و ثنا کہہ رہے ہیں۔ یہ کئی کے دانے کسی بیج کے پتیار
 دانے ہیں، وہ بڑھا کر سان ایک بوڑھا چکاری ہے اس آگ میں عنبر اور نوبان حل ہا ہے
 جس کا دھواں اٹھ کر سارے معبد کو معطر کر رہا ہے۔ یہ نیک نفس روصیں میں، یاں ابدی
 سکون ہے اور قدرت کا رحم!

سارو گاؤں والے مسافر کو ایک عزیز مہمان بلکہ اپنا بھائی سمجھتے اور اسے اپنی خوشیوں
 میں شریک کرتے بھولے بھالے کسان، اٹھ چرواہیاں ننھے ننھے بچے اسکے گرد جمع ہو جاتے
 مسافر اپنی تاروں والی منبری سناؤ، مسافر اپنی تاروں والی منبری سناؤ۔ آگلی اسکے شانے
 پر اپنی بانہ نیک دیتی اور دوسری بانہ سے اسکی انگلیوں میں ضرب کو پکڑ لے کہتی 'لو بجاؤ، راہی!
 اپنی تاروں والی منبری بجاؤ، یا پھر کھلیانوں کے لمبے لمبے سایوں میں کوئی اس سے کسی کہانی
 کی فرمائش کرنا، اس دنیا کی کہانی جہاں لمبے لمبے میدان ہیں۔ بڑے بڑے دریا ہیں، میلوں
 تک پھیلے ہوئے شہر ہیں، جہاں لوہے کے تاروں پر کڑی کے مکان قطار بنائے ہوئے بھاگے
 جا رہے ہیں کہیں سے کوئی ایک بٹن دبا دیتا ہے اور لاکھوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔
 آسمان پر اڑن کھٹولے گھوم رہے ہیں اور نیچے بازاروں میں وہ پریاں محو خرام ہیں جن کے
 لباس تفتیروں کے پروں سے بنائے گئے ہیں۔

اس طرح مکی کے کھلیانوں میں کئی چاندنی راتیں گزر گئیں ایک ات مسافر نے پہلے
 قطعہ میں فیروز کا الغوزہ سنتے ہوئے محسوس کیا کہ آنگی وہاں نہیں ہے۔ دوسرے قطعے میں مکی
 کے دانوں کو بھٹوں سے الگ کرتے ہوئے اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر آنگی کہیں نظر نہ آئی
 تیسرے قطعے میں مسافر نے ایک بخش کہانی سنائی جو شہروں کی زندگی کے متعلق تھی، اُس کی
 نگاہیں آنگی کو تلاش کرتی رہیں، مگر بے سود، چوتھے قطعے میں اُس نے اپنی دائلن کو نکالا اور ایک
 دوسرے نغمہ چھیڑا، باقی قطعوں سے اُٹھ کر سارو گاؤں والے چوتھے قطعے میں آجمع ہوئے اور
 مکی منبری سننے لگے، اُنکے چہروں پر خوشی تھی اور حیرت بھی — مگر آنگی کہاں تھی؟
 آخر مسافر نے پوچھ ہی لیا۔

ایک نوجوان کسان نے بے پروائی سے کہا، وہ کھلیان کے اُس طرف بیٹھی ہے ابھی
 تھوڑا عرصہ ہوا اپنی سچھی لہیوں میں بیٹھی گا رہی تھی کہ فیروز کی بہن نے دجانے اُسے کیا کہا کیوں
 دلشاد تم نے کیا کہا کہ وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ اور جھولی میں بہتے بھٹے بھر کر لے گئی، اب اکیلی بیٹھی
 دلے الگ کر رہی ہوگی۔ کون منانا پھرے، کن تو کیوں نہیں جا کر منالاتی اُسے؟
 کرن منس پڑی، مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کھلیان کے دوسری طرف مسافر نے دیکھا کہ چند مکی کے جھٹے زمین پر پڑے ہیں اور انکے
 قریب کھلیان کا سہارا لٹے ہوئے آنگی نیم دراز حالت میں پڑی ہے، اُنکھیں نیم وا ہیں اور چاند
 کی کرنوں نے اُس کے سر کے گرد ایک ہالہ سا بنا دیا ہے۔
 آنگی!

آنگلی !!

آنگلی !!!

مسافر آنگلی پر جھک گیا۔ اُس نے آنگلی کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا "کیا بات ہے آنگلی؟"

آنگلی اٹھ بیٹھی۔ اُس نے آہستہ سے اپنے آپ کو مسافر کے بازوؤں سے علیحدہ کر لیا اور مٹی کے دانے الگ کرنے لگی۔

آخر اُس نے کھٹے ہوئے لہجہ میں کہا: "آہ مسافر مجھے یہاں سے لے چلو!" یہ کہہ اُس نے سر جھک بکالیا، اور چپ چاپ رونے لگی۔

مسافر خاموشی سے مٹی کے دانے الگ کرتا رہا، اُس نے آنگلی کے آنسو نہیں لوٹے۔ اُس نے اُسے پیار نہیں کیا، یکایک ایک پرندہ اپنے سیاہ پر پھیلائے ہوئے تیر کی طرح سامنے سے نکل گیا کھلیان کے اوپر دو تین تارے چمک رہے تھے۔ آنگلی کے آنسوؤں کی طرح اور کھلیان کے دوسری جانب عورتیں نئی دہن کی سسرال کو روانگی کا گیت گارہی تھیں مسافر کی نگاہیں پہاڑوں سے پرے صنوبروں کے جنگلوں کو چیر کر وسیع میدانوں کو ڈھونڈنے لگیں جہاں اُس کا دیس تھا۔ اُس کی نگاہوں میں ریل گاڑی کے پتے اچھلنے لگے۔

مسافر خدا کا شکر بجالاتا ہے کہ وہ اپنی دنیا میں واپس آگیا، اپنی تہذیب کی دنیا میں،

کبھی خیال کرتا ہے شاید میں نے غلطی کی کبھی کبھی اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھ بیٹھ خوش
 فحیایاں کرتے ہوں اُس کے کانوں میں عجیب عجیب الفاظ کو بجنے لگتے ہیں سراسی تم کتنے
 عجیب ہو رہی۔ تنقہ کہ اُس کے چہرے سے مسکراہٹ کا فور ہو جاتی ہے اور وہ سوچتا ہے
 کہ شاید کسی نیلے جھونے پر ریوڑ کو پانی پلاتے ہوئے ایک غریب لڑکی اُس کا انتظار کر رہی ہے
 اُس کے پاؤں نیچے ہیں اُس کی نگاہیں اداس ہیں اُس کے بالوں میں صیب کے پھولوں
 کا گچھا ہے۔ —!

اُٹھ گی!

صرف ایک آنہ

سروش کنگ جارج ڈاکس (KING GEORGE DOCKS) پر گیا
 وہاں اُسے ایک فورمین (FORE-MAN) مل گیا، فورمین نے ایک نیلے رنگ
 کی قمیص اور تپلون پہن رکھی تھی، جس پر جاجا تیل کے دو جیسے قطر آ رہے تھے اور اُسکی چھوٹی
 سی ناک پر ایک بہت بڑی عینک تھی۔ بہ نسبت مجموعی وہ ایک گندہ بد نما اور جھڑل انسان
 نظر آتا تھا۔ سروش کو اس کی آنکھوں میں نرمی و ملائمت کی ایک خفیت سی جھپک دکھائی دی
 پس اُس نے فورمین سے ملنے ہی کہہ دیا کہ وہ ایک "بریکار" ہے اور کسی کام کی تلاش میں بیٹا
 آیا ہے۔

”تم کیا کر سکتے ہو“ فورمین نے پوچھا۔

نماک کے نقصانوں کو سہلانے ہوئے کہا بہت مشکل کام ہے اور غالباً تم اسے نہ کر سکو گے۔ اور
 شاید پسند بھی نہ کرو۔“

”کیا کام ہوگا“ سروش نے پوچھا مگر ٹھہر دیا۔ — مجھے نہ بتاؤ میں اسے کر لوں گا۔
 پولیشین نے مسکراتے ہوئے کہا: تم تنخواہ معقول دیتے ہیں۔ ہاں تو — تین روپے
 روزانہ اور دن میں صرف دس گھنٹے کام۔ — وہ رُک گیا اور کھڑکی سے باہر نگلی کے
 گدے پانیوں کی طرف دیکھنے لگا، پھر بیک لخت وہ سروش کی جانب مڑا، ”کیا تم پولیشین ہو؟“
 ”نہیں“

”اُہم! میرا بھی یہی خیال تھا۔“

”کیا تم ایک لوہے کی میخ کو لکڑی کے تختے میں سیدھا گزار سکتے ہو؟“ پولیشین نے پوچھا
 ”میں تم سے یہ سوال اس لئے کر رہا ہوں کہ یہی کام تمہیں اس پل پر کرنا ہوگا میںیں گارنٹی
 دن بھر لکڑی کے تختوں میں میںیں گارٹے چلے جانا، کیا تم اسے کر سکو گے؟“
 ”کر سکوں گا“ سروش نے جواب میں کہا۔ ”میرا باپ انجینئر —“

”چچ“ پولیشین نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہارے شجرہ نسب سے کوئی
 لپسی نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے رُکا، پھر سروش کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”ساٹھ
 روپے میں یہ کام ہو سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے پھر ایک پُر معنی انداز میں سُرش کی جانب دیکھا
 سُرش نے کمزور لہجے میں جواب دیا، ”لیکن میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔“
 پولیشین کو غصہ آگیا کہنے لگا۔ ”میں کہتا ہوں، کیا تم مجھے گاڈی تصور کرتے ہو میرے

پاس ملازمت کے لئے استدعا کرنے آئے ہو۔ کیا میں تمہارا چچا ہوں (میز پر کیکہ ماد کر) ہم
یہاں صرف یوریشین لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں، سمجھے، مگر میں شاید اس امر کی بھی پروا نہ
کرتا۔ کیا ساٹھ روپے زیادہ ہیں۔ اور پھر تم تو اس کام سے بھی واقف نہیں ہو۔ کیا تم ایک
لوہے کی مینج سیدھی طرح لکڑی کے تختوں میں سے گزار سکتے ہو؟ مجھے شبہ ہے۔ تم میں کئی
فنی خامیاں ہیں۔ کیا تم نے کبھی صنعتی درسگاہ میں تعلیم پائی ہے؟ — لیکن میں اسے بھی
جانے دیتا، صرف ساٹھ روپوں کے لئے یہ رقم زیادہ نہیں۔ اور جب ہم نوکر ہو جاؤ
تو **ننخواہ** اور تین روپے روزانہ مشاہرہ حاصل کر دگے تو ہم یقیناً میرے شکر گزار ہو گئے۔ نوکرا کو روپے " یہ
کہکھ یوریشین نے اپنی تقریر ختم کی اور مربیانہ انداز سے سروش کی طرف دیکھنے لگا۔
"لیکن... لیکن" سروش نے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا "میرے پاس تو ایک
کوڑی بھی نہیں، ایمان سے کہتا ہوں۔"
یوریشین نے جواب میں اپنے کندھوں کو ایک اضطراری حرکت دی۔ اور کھڑکی سے
باہر دیکھنے لگا۔

سروش نے اُسے سہمہ سے کہا "میں تمہیں اپنی ننخواہ سے دو روپیہ یومیہ دینے کو
تیار ہوں۔ اگر —"

یوریشین نے اپنے مخصوص اینگلو انڈین لہجہ میں کہا "سب فضول باتیں ہیں۔ اب
وہ ہر ایک لفظ پر زور دے کر فقروں کو ادا کر رہا تھا۔ ایک دفعہ.. جس دن تمہارا نام
رجسٹر میں درج ہو گیا۔ تم میرے اختیار سے باہر ہو گئے، سمجھے؟"

سروش چند لمحوں کے لئے چپ رہا، وہ حیران تھا کہ کیا کہے، ساٹھ روپے کہاں سے لائے۔ کس سے مانگے۔ کون اُسے ادھار دے گا۔ اُس کے پاس تو کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی۔ جسے وہ گمروی رکھ سکتا، وہ دودن سے بھوکا تھا۔ وہ پھر یوریشین سے ملتی ہوا۔
 ”آپ مجھ پر یقین رکھیں“ سروش نے نہایت لجاجت سے کہا۔ ”میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ...“

مگر یوریشین نے اُسے فوراً روک دیا، کہنے لگا۔ چلو نکلو یہاں سے تمہیں کھاتے ہو یہ کوئی گریبا گھر نہیں ہے۔“

جب سروش باہر نکلا تو مغرب میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ایک دُغانی جہان کی گھنٹی متواتر چیخ چیخ کر جہازوں کے بلبلوں کو بلبل رہی تھی۔ ہلکی کاپانی شعاؤں کے انعکاس سے سُرخ تھا۔ سروش کو احساس ہوا، جیسے کسی نے آسمان کے مغرب کو نے میں سورج کو قتل کر دیا ہے اور اب اس کا لہو بہ کر ہلکی میں آ رہا ہے۔ اُس نے ایسا محسوس کیا۔ کیونکہ فضا میں بھی موت کا سا سکون تھا اور ایک گرم تعفن، بدبو لکڑی کے گیلے تختوں سے اُٹھ رہی تھی، یکایک پاس کے گھاٹ سے کوؤں کا ایک جھنڈ کرخت آواز میں کانیں کھینچ کر کترتا ہوا مغرب کی جانب پرواز کر گیا۔ سروش نے ایک آہ بھری اور یورینی ایک سمت کو چل پڑا۔

سروش نے کوڑا کرکٹ اٹھانے والی کارپوریشن کی لاری کو دیکھا جو ایک سبلی کے پاس کھڑی تھی۔ لاری چلانے والا قریب کی ایک دکان سے پان خرید رہا تھا۔ دن بھر کا رات

ایک ایک چھٹا سا غریب بازاری کتا کہیں سے آنکلا۔ سردی سے ٹھٹھرتا ہوا، دم دبائے ہوئے لاری کے قریب پہنچا، اور پہیوں کو سونگھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ تپلی سی آوازیں چلانے لگا، بچا را غریب کتا شاید کئی دن سے بھوکا تھا اور اب میلے سے لدی ہوئی گاڑی سے ایڑنیا کی بو اُس کے نھنوں میں گھسی جا رہی تھی، اُس کے داغ پر مسلط ہو رہی تھی، اُس کی اشتہا کی جس کو اذیت پہنچا رہی تھی۔ بھوکے سردش نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے بٹھنی ہوئی مچھلی کی پلٹ ہو تو اس کی اشتہا انگیز ہو بھی اسی طرح اُس کے داغ کو پریشان کر دے گی۔

کتنے کی چغیں بلند ہوتی گئیں۔ وہ پہیوں کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ بچا را لاری کے اوپر تو نہیں چڑھ سکتا تھا۔ شاید وہ عالم تصور میں عمدہ عمدہ کپڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ چھڑی ہوتی ہٹی، ہا سی ڈبل روٹی کے ریزے، اتنے میں ڈرا بیٹو آگیا۔ پانوں کا پلندہ سنبھالے ہوئے آتے ہی اُس نے کتے کی کمر میں زور سے ایک لات جمائی۔ ایک لمبی، بلند، چنچ۔ جیسے کسی انسان کی ہوتی ہے۔ اگر اُسے ایک دو ہنر لگا دیئے جائیں۔ بچا را کتا بھاگ نکلا۔ اس کی چھوٹی سی دم پھیلی لاتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے سے جا لگی تھی۔ کتا بھاگتا بھاگتا سڑک کی دوسری طرف چلا گیا۔ جدھر سردش کھڑا تھا، چاؤں چاؤں کر رہا تھا۔ سردش کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر اور اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے اپنی چغیں کم کر دیں۔ پھر دو تین لمبی چنیوں کے بعد وہ چپ ہو گیا اور سردش کے قریب کھڑا ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے دم ہلانے لگا۔

یہ جذبہ امید تھا کہ اظہارِ سہمردی ہے

کتا سروش کے قدموں کے گرد گھومنے لگا۔ جس طرح پہلے وہ لاری کے پہیوں کے گرد گھومتا تھا لیکن اب وہ زیادہ پُر امید معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار دم ہلارہا تھا۔ بار بار زمین سے ٹک رہا تھا۔ پھر وہ یکایک کھڑا ہو گیا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سروش کے چہرے پر جمادیں اور دم ہلانے لگا

”ایک بسکٹ کھاؤ گے، بسکٹ؟“

یہ سروش کا آخری بسکٹ تھا۔ اس نے اُسے جیسے نکال لیا۔ کتنا خشک اور کراہا دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹے کتے نے اُسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ چھوٹی چھوٹی ٹخیں مارتا ہوا خوشی سے سروش کے گرد اچھل رہا تھا اور زور زور سے دم ہلارہا تھا۔ . . . آخر سروش کو وہ بسکٹ دینا ہی پڑا۔ . . . کتے نے ایک لمحہ میں اسے حلق کے نیچے اتار لیا۔ ایک لمحہ بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے۔ سروش شاید کتے کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھ رہا تھا۔ ایک بھوکا آدمی تھا اور ایک بھوکا کتا اور اب دونوں ٹکر کے کنا رے چپ چاپ مغموم کھڑے تھے۔ جیسے دنیا سے باہر نکال دینے گئے ہیں۔

ایک لمبے وقفہ کے بعد سروش نے سر جھکایا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ کتا آہستہ آہستہ اُس کے پیچھے آ رہا تھا۔

وہ رات اُس نے سیالہ سٹیشن پر سیر کی تھی وہ کلاس وٹینگ روم کا پختہ فرش جس پر بیسٹ لگا ہوا تھا سخت اور ٹھنڈا تھا۔ سے مشکل ہی سے وٹینگ روم کہا جاسکتا تھا۔

کیونکہ یہ ایک کردہ تو نہ تھا بلکہ محض ایک برآمدہ سا تھا۔ تین اطراف سے کھلا اور چھت پر ٹہن
 کے پرانے تختے اور چھت کے نیچے کہیں کہیں لہے کے کھنبے تاکہ چھت کو سہارا رہے اور
 کرنے نہ پڑے۔ سروش اس برآمدے سے باہر سیاہ آسمان پر انگاروں کی طرح دمکتے ہوئے
 تاروں کو دیکھ سکتا تھا اور ہاں ایک سیلا سا مٹیالی رنگت کا چاند بھی دکھائی دے رہا تھا
 یہ چاند ایک بچے ہوئے ولایتی لیک کی مانند تھا جو ابھی ابھی نگھیٹھی سے باہر نکلا گیا ہو۔ سروش
 نے اُسے دیکھتے دیکھتے اپنی آنکھیں بند کر لیں ہاں وہ تھکا ہوا تھا اور بھوکا تھا۔ دن بھر
 وہ میلوں چلتا رہا اور کلکتے کی گلیوں میں اُس کے شاندار ہزاروں اور یہ شکوہ چوکوں میں
 گھومنا رہا تھا، وہ ایک پاگل آدمی کی طرح چکر کاٹتا رہا۔ اُس دیوانے کی طرح جو محض اپنے پیٹ
 کے لئے دیوانہ ہو گیا ہو۔ لیکن اُسے نوکری کہیں نہ ملی۔ اُسے نوکری کیوں نہ ملتی تھی؟ کیوں
 لوگ اُس کے غریب زدہ چہرے کو دیکھ کر چرچا مچاتے تھے۔ جیسے کسی چیز نے انہیں شرمندہ
 کر دیا ہو۔ لیکن کیوں؟ مگر اب سروش کو ان باتوں کی پروا نہ تھی۔ وہ آج بہت
 تھکا ہوا تھا۔ اس کا دماغ کام کرنے سے رُک گیا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ شاید اُس کے
 دماغ کے ساتھ ٹانگیں نہیں ہیں بے حد نکان تھی جیسے شراب کا نشہ ہو۔ پھر اُسے ایسا
 معلوم ہوا جیسے کوئی اندر داخل ہو کر اُس کے جسم کی ہڈیوں کو توڑ رہا ہے۔ اُس کے معدے
 کو مٹھی میں دبا کر زور سے بھینچ رہا ہے، اُس کے ماتھے پر تیز تیز سوسیاں چھو رہا ہے آہ.....
 اُس نے اپنی ٹانگیں فرش پر پسا دیں اور بازو پھیلا دیئے۔ ہاں سینٹ کا فرش خوب ٹھنڈا
 تھا۔ اُسے ٹھوڑا سا سکون حاصل ہونے لگا۔ نکان سے اینٹھے ہوئے اعضا آہستہ آہستہ

ڈھیلے پڑنے لگے۔ اب اُسے اگر کہیں سے تھوڑی سی روٹی مل جاتی۔ بس ایک دو ٹکڑے بیوقوف، اُس نے اپنا بسکٹ کتنے کو کیوں دے ڈالا، بیوقوف سروش آہستہ آہستہ اپنے ننگے بازوؤں کو فرش پر پھیلانے لگا۔ ہاں فرش خوب ٹھنڈا تھا، ٹھنڈا صاف اور خشک۔ گلی یا سڑک کے فٹ پاتھ کی طرح نمدار اور گرد آلود نہیں تھا۔ مجھے آئندہ یہاں ہی سونا چاہیے۔ اس نے دل میں سوچا۔ یہ جبکہ اس وقت نوکانی دیرانی دکھائی دیتی ہے اور پھر یہاں کوئی پولیس کا سپاہی بھی نظر نہیں آتا تھا اور کسی بھلے مانس نے بجلی کا بلب بھی توڑ دیا ہے بیکایک اس کا ہاتھ کسی نرم و گرم شے سے ٹکرایا۔ یہ ایک ہاتھ تھا جو نہی غیر شعوری طور پر ہی اس نے اس کی انگلیوں کو چھو آ۔ پھر اس کی پھیلی کو، پھر کلائی۔ اس کے بعد اس کی انگلیاں ایک کانچ کی چوڑی پر جا کر رگ گئیں۔ سروش نے آنکھیں کھولیں۔ اُس کے نزدیک ایک کونے میں ایک عورت گھٹنے بسٹے ہوئے لیٹی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ وہ سو رہی تھی اس کا سیاہ بازو نرم اور گداز تھا۔ اُس کی دھیمی سانس باتا عدنی سے چل رہی تھی۔ ایک سخت پلٹ کر وہ اس کے پہلو کی طرف مڑ گیا۔

”نم کون ہو؟“ عورت نے ایک مدہم معنوم لہجہ میں پوچھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک مرتبہ سروش کی طرف دیکھا۔ پھر انہیں بند کر لیا۔ وہ ابک غریب بھیک مانگنے والی عورت تھی۔ وہ غریب تھی اور بد صورت اور بے حد تھکی ہوئی اُسے کس کی پروا ہو سکتی تھی !

صبح کے دھندلے میں پولیس کے ایک سپاہی نے ٹھوکر سے سروش کو جگا دیا اور دھکا

دے کر ویننگ روم سے باہر نکال دیا۔ عورت سروش سے پہلے ہی کہیں جا چکی تھی۔
خدا جانے کدھر۔

”دوسری رات نہ اگرمیں نے تمہیں یہاں سوئے ہوئے دیکھا۔ پولیس کا سپاہی کہہ ہاتھا
”تو میں تمہیں سیدھا جیل خانے پہنچا کر دم لوں گا۔ حرام زادہ کہیں کا۔ سو رکابچہ..... نکل
یہاں سے.....“ سروش آنکھیں ملتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔ سپاہی کی گالیوں کا اُس پر کچھ
اثر نہ ہوا۔ کیسی اچھی رات تھی اور ہاں اُس مہربان بھیک مانگنے والی عورت نے اُسے کتنا آرام
دیا تھا۔ ایک لمبے سے چلتی ہوئی جیسے وہ اپنے سر کے نیچے دبائے ہوئے تھی۔ بہت سی عمدہ
عمدہ چیزیں بندھی تھیں چند کھجوریں، ایک نابیل اور ایک پوری روٹی..... اب وہ کہاں
تھی؟..... کیا وہ اُسے پہچان سکے گا؟..... مہربان بھکارن!.....

بیکایک کسی نے اُسے دھکا دیا۔ کیا تمہاری آنکھیں..... کیا..... کیا تم اندھے ہو گئے
ہو۔ ایک موٹا باز کہہ رہا تھا..... راستہ دیکھ کر نہیں چلتے۔ سر پر چڑھے آتے ہو..... جراحی
بھک مٹگے..... بدعاش! اسی طرح گالیاں دیتا ہوا موٹا بالو آگے گزر گیا۔

لیکن شاید سروش نے اُسے نہیں سنا۔ وہ بہت دور اپنی خیالوں کی دنیا میں گم تھا اور ساری
کائنات اُس کے گرد چکر کاٹ کاٹ کر واپس بھاگ رہی تھی۔ اُس نے سوچا۔ کتنا ہی اچھا ہو
اگر وہ ایک بھکارن بن جائے۔ اس میں بُرائی ہی کیا ہے۔ اب تو یوں بھی اُسے لوگ بھک مٹگا
سمجھتے ہیں..... اور پھر بھک مٹگے انسانوں سے زیادہ رحمدل ہوتے ہیں.....

منگنتو، بھکاریوں کا سردار لائیں پھیلانے چٹائی پر چھتہ پی رہا تھا۔ اس کی توند موٹی تھی اور
 واڑھی سفید۔ اس نے سردوش کو کھلے کھلے اور لمبے کاروں والی ملگجی قمیض دی اور سیلی سرسج کا
 کوٹ جس پر تیل کے بڑے بڑے دھبے تھے اور ایک گرے فلائین کی تپون اور ایک چمڑے
 کا بیگ یہ لو بیٹا، منگنتو نے کہا۔ ان کپڑوں کو پہن لو، اور اس بیگ کو ہاتھ میں تھامے
 رکھو۔ دیکھو اس بیگ میں کیا ہے؟ اس نے بیگ کھولتے ہوئے کہا: ایک پرانی قمیض ایک
 دانت صاف کرنے والا برش، ایک پرانا استرہ، زنگ آلود اور گھسے ہوئے صابن کی ڈبیہ۔
 بس یہی تمہارے متھیا رہیں۔ یہی تمہاری دوکان ہے۔ ان سے اچھی طرح فائدہ حاصل کرو تم
 کہتے ہو کہ تم کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہو۔ میں اس بات پر بغیر سرٹیفکیٹ دیکھے یقین کرتا
 ہوں۔ ہمارے ٹولے میں کئی دسویں پاس بھکاری ہیں لیکن تم پہلے گریجویٹ بھکاری ہو، جیسا
 میں نے شروع میں کہا۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تمہاری لیاقت پر تمہاری دانائی پر مجھے امید
 ہے کہ تم ہمارے پیشہ کے لئے باعث فخر ہو گے۔ اب اسی پیشہ کو پکڑو۔ ہمیشہ کے لئے اور
 اپنی ان تمام چالاکیوں کو کام میں لاؤ جو تم نے زمانہ تعلیم میں حاصل کی ہیں۔ اگر تم ہوشیار
 رہے تو ایک دن میری جگہ حاصل کر لو گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کلکتہ انگریزی سلطنت میں
 جہاں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔ وسعت اور آبادی کے لحاظ سے دوسرا شہر ہے میں
 نہیں جانتا یہ سچ بھی ہے کہ نہیں۔ لیکن اگر ایسا ہو تو کالی مانا تمہیں تو فیت دیں کہ تم اس کا
 زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکو۔ لو بیٹا، منگنتو نے اپنی تقریر ختم کی اور پھر چند دھنوں کے لئے
 رگ گیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اس کے چٹائی کے قریب پڑے ہوئے بوٹوں کے ایک

جوڑے کو اٹھا لیا اور سروش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا: "اور ہاں بیٹا میں تو انہیں بالکل ہی بھول گیا تھا۔ انہیں بھی پہن لو۔"

سروش چٹائی پر بیٹھ کر انہیں پہننے لگا۔ بہت پرانے بوٹ تھے سوکھا ہوا چمڑا اگرچہ خود بے رنگ و بد زیب۔ بیکایک سروش کی نگاہیں ایک سبز لیل پر پڑیں جو بوٹ کے اندر لگا ہوا تھا۔ سروش کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس کے کپجے میں برہمی بھونک دی ہو۔ یہ ایٹو نیا مارکہ بوٹ تھا۔ وہی پرانا سبز لیل۔ انہیں بوٹوں کو وہ ہمیشہ کالج کے دلوں میں جاسن ایسٹڈ کو کی دکان سے خریدا کرتا تھا۔ شاید یہ قسمت کی وحشیانہ سرچھی تھی۔ کوئی کہتی ہے اُس کے دل کو موسس رہا تھا۔ بیکایک اُس کا گلاب بند ہونے لگا۔ کوئی غیر مرنی طاقت اپنے آہنی ہاتھوں سے اُس کے گلے کو دبا رہی تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اگر وہ اسوقت زبول سکا تو پھر شاید ہمیشہ کے لئے چپ ہو جائیگا۔ اُس نے بازوؤں سے ہوا میں کسی کو کپڑے کی کوشش کی۔ اُس نے منہ کھول کر ہوا کے ایک دو گھونٹ نیچے اتارنے کی کوشش کی۔ اُس نے بولنا چاہا، اور پھر بیکایک اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور ایک بلند وحشیانہ چیخ یا مہنسی اُس کے لبوں سے پھوٹ نکلی۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا بند بند مہنسی سے کانپ رہا تھا۔

"مت مہنو، سنگتو نے کانپتے ہوئے کہا۔ کالی ماما کے لئے اس طرح مت مہنو۔
سروش چیخا گیا۔ یا شاید مہنتا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے گئے۔ تیز و ترش آنسو۔ جو انگاروں کی طرح گرم تھے۔ جو اُس کے خشک روکھے خناروں کو جن پر ٹڑھی بڑھی

ہوئی تھی۔ سیراب کر رہے تھے۔ اور اس کی لمبے لمبے کالروں والی ٹلگھی قمیض کو تر کر رہے تھے۔ بیکایک اس نے چمڑے کے بگ کو ہاتھ میں تھام لیا۔ اور تیزی سے بھاگ گیا۔

اس دن دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں چترنجن یاوی نیو کے پاس مان سنگھ ٹکسی ڈرائیور کو ایک پولیس سارجنٹ نے روک لیا۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا جس میں ایک آدمی ایک تیزی سے بھاگتی ہوئی لاری سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا تھا۔ مان سنگھ نے دیکھا کہ ٹرک کے درمیان لہو سے سرخ جگہ پر ایک آدمی بیہوش پڑا تھا۔ وہ ایک پرانا نیلا کوٹ پہنے تھا اور اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھیجی ہوئی تھیں۔ پولیس سارجنٹ نے مان سنگھ کو مدد کیلئے کہا۔ مان سنگھ اور پولیس سارجنٹ دونوں نے ملکر اس آدمی کو ٹکسی میں لٹا دیا۔ جب مان سنگھ نے بیہوش آدمی کا جسم ایک لمبی سیٹ پر رکھا اور اس کی بھیجی ہوئی مٹھیوں کو ٹھیک کیا تو اس نے دیکھا کہ دائیں ہاتھ کی گھٹی ہوئی ہتھیلی میں کوئی چمکتی ہوئی چیز دبئی پڑی ہے۔ اس نے جھاک کر غور سے دیکھا۔ یہ ایک آنہ تھا!

لاہور سے بہرام گلہ تک

میں اور کلیم مشن کالج کی لائبریری میں بیٹھے چینی مصوری کے متعلق ایک کتاب دیکھ رہے تھے۔ بابوں کہتے کہ کتاب کی جاذبِ نظر تصاویر پر اچھٹی ہوئی نگاہیں ڈال رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ گفتگو گو آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ پھر بھی لائبریری کے وسیع سنڈے میں شہد کی مکھڑوں کے بھنبھانے کی سی گونج پیدا ہو گئی تھی۔ گفتگو کا موضوع نہایت دلچسپ تھا یہی سینما کی ایڈٹریسیں کچن کا ٹماٹر، پیاز، دلفریب ساڑھیوں پر ڈیسروں کی حماقتیں وغیرہ وغیرہ

یونہی اوراق اُلٹے اُلٹے 'لی بانگ' کی مشہور و مقبول تصویر شفق سامنے آگئی، وہی

ٹپڑے ترچھانے والی شہزادی سے ملتے جلتے۔ ہمرنگ، جھل کے پھسکے سے نیلے پانی

میں مغربی پہاڑوں کی سبز سبز چوٹیاں اور ان پر پھیلے ہوئے اٹھتے ہوئے چمکتے ہوئے
نارنجی بادلوں کا انعکاس — لی بانگ کی مصوری حقیقت میں مسحور کن ہے۔

کلیم نے اپنی لمبی بے چین، مخروطی انگلیاں جو اس کے طبعی رجحان کو غیر شعوری طور پر
دماغ کر رہی تھیں، آہستہ سے شفق پر رکھ دیں اور پھر مہربی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”میں پرسوں شملہ جا رہا ہوں کانظمی کی کوٹھی خالی پڑی ہے تم بھی چلو!“
میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں لاہور سے کہیں
باہر نہ جاسکوں گا۔“

کلیم نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“
”میں نے کہا کیا کہوں، کچھ حالات ہی ایسے ہیں۔“
کلیم چپ ہو رہا اور لی بانگ کی ”شفق“ کو غور سے دیکھنے لگا۔ شاید اس چینی
شاہکار میں شملہ کے ابھرتے ہوئے نقوش نظر آ رہے تھے۔

مگر حالات بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ میں لاہور سے اٹھ کر گھر آیا، تو مکند نے دیر
نہ سوچا (جلدی سے ایک تار بیکس ہوا کہ کیا، الفاظہ چاک کر کے پڑھا۔ لکھا تھا۔
میر لو کہ کشمیر

میری شادی، بس جون، جلدی پہنچو
”گور بخش“

اچھا تو یہ بات تھی۔ مدت سے مجھے گورنمنٹ کا کوئی خط نہ ملا تھا اور میں حیران تھا کہ اس امر کو اس کی سستی پر محمول کروں یا اس کی بیوفانی پر۔ آج معلوم ہوا کہ خط نہ لکھنے کے اور بھی بہت اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً محبت، شادی، موت اور علیٰ ہذا القیاس۔

گورنمنٹ میرا بگڑی دوست ہے، مکتب کی شرارتوں میں ہم دونوں نے ہمیشہ اکٹھے حصہ لیا اور عموماً اکٹھے ہی بیٹھے۔ دو محصوم دلوں کی رفاقت کے لئے اس سے بڑھکر بچتہ اور کونسی بنیاد ہو سکتی ہے اور گو اب نگر معاش نے گورنمنٹ کو مجھ سے جدا کر کے لاہور سے دوسری کے ایک غیر دلچسپ گوشے میں پھینک دیا ہے، پھر بھی یہ معاشی و جغرافیٰ محبوباں ہماری دلی رفاقت پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

معاش - روزی - خوار
دو رفاقت جوں
سہر اوقات

گورنمنٹ میرے لور میں دوسری پٹول کی انجنیسی کا مالک ہے، کئی بار اس نے مجھے میرے لور آنے کو لکھا ہے۔ لیکن ہر بار مختلف وجوہ سے میں میرے لور نہیں جاسکا اور اب میں تار ہا تھا میں نے یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے گورنمنٹ کی شادی پر جانا چاہئے یا نہیں، آخر گورنمنٹ دوست ہے اور دوست کی شادی یا موت ہر روز نہیں ہوا کرتی، لیکن — تصویر کا دوسرا پہلو شملہ ہے اور کاظمی کی کوٹھی بھی خالی ہے شملہ اور میرے لور میں وہی فرق ہے جوں کی بانگ کی "شوق" اور مشن کالج کی لائبریری میں ہے اور پھر یہ توصیف ظاہر ہے کہ اگر میں میرے لور چلا جاؤں تو پیرسول شملہ نہیں جاسکتا۔ بالفاظ دیگر اگر میں پیرسول شملہ چلا جاؤں تو گورنمنٹ کی شادی دیکھنے سے رہ جاتی ہے اور اگر کل میرے لور چلا جاؤں تو کاظمی کی کوٹھی خالی پڑی رہ جاتی ہے۔

اس شش و پنج کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ناچار جنت یا طاق کے عملیہ کو کام میں لانا پڑا۔ ایک پیسہ چہرہ شاہی کو اونچا ہوا میں پھینک کر اور چہرہ شاہی کو شادی کا مبارک عنوان سمجھ کر میں خاموش ہو رہا۔ دوسرے لمحہ میں پیسہ زمین پر پڑھا اور چہرہ شاہی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

بہت اچھا۔ شملہ نہ بھی میر لوہری ہی۔ مجھے ڈھونڈھ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔
رات کو سارے نو بجے کی گاڑی پر سوار ہوا اور دوسرے دن صبح میر لوہری پہنچ گیا۔
میر لوہر کا یہ چھوٹا سا شہر ریاست کشمیر کی عملداری میں ہے۔ لیکن اگر یہ کشمیر کے بجائے راجپوتانہ کے ریگستان میں ہوتا تو زیادہ موزوں رہتا۔ وہی گرم خشک بڑا ہوا، تمازت آفتاب سے جلی ہوئی پہاڑیاں، پھیکے بے مزہ کنوئیں۔ یہ بھلا گور بخش کو کیا سوچھی یہاں آکر ٹیڑول کی اکھنسی تولی ہی تھی۔ اب کیا ایک صحرائی دلہن ہی سے عمر بھر کا پیمانہ باندھنا تھا۔

رات کو پہاڑی گیتوں اور ڈھولک کی پُرسنور آواز کے درمیان جب میں نے گور بخش سے اچانک یہ سوال کیا تو اس نے کچھ توقف کے بعد مسکرا کر کہا۔ یہ سب کجنت وال کا قصہ ہے۔ اسے جو چاہو سنا دے لو۔

”خوب، تو پھر یہ ’لو میرج‘ ہے کیا؟“

”گور بخش مسکرا کر چپ ہو رہا

”مگن میں کسی طرح کی ایک نیا گیت شروع کیا تھا، اس کا پہلا بند مجھے یاد ہے۔“

ایک بدلی آساؤن دی
 کچرک ڈیک رکھاں ماہے دے آؤن دی
 سب پھیر دلاں دے فی ماے مینوں دس کھاں فی ماے !

شادی کے بعد یہ صلاح ٹھیری کہ گورنمنٹ کوٹہنی مون (HONEY-MOON) منانے کا موقع ہرگز نہ دیا جائے بلکہ چار پانچ دوستوں کی ٹولی میں اُسے بھی مل کر کے خوب ادھر ادھر سیر کی جائے۔

جگدیش نے اپنی عینک صاف کرتے ہوئے کہا: ”کدھر کی سیر ہوگی؟“
 اوتار سنگھ نے اپنے نیلے نازک لبوں پر زبان پھیر کر کہا: ”ان جلی ہوئی پہاڑیوں میں کیا خاک دھرا ہے؟“

چاچو نے چپک کر کہا: ”میں بتاؤں چلو سڑیک تک ہو آئیں پیدل چلنا ہوگا۔
 خوب لطف رہے گا؟“

ایک لمحے — بس صرت ایک لمحہ کے لئے ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا
 پھر ہم سب خوشی سے تالی بجا کر بول اُٹھے۔

”واہ۔ واہ۔ کیا اچھی تجویز ہے۔“ ”بھئی کیا خوب؟“ واللہ تمہیں کیا خوب سوچھی —
 قربان علی نے گورنمنٹ کی پیٹھ بٹھکتے ہوئے کہا: ”اب کیا ارادہ ہے تمہارا اس بارے میں؟“
 گورنمنٹ نے مری ہوئی آواز میں کہا: ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

اس پر پھر ایک زبردست زبردست قہقہہ ہوا۔

میر پور سے چلے تو تیسرے دن کوٹلی آئے، کوٹلی پہنچ کر میر پور کے چلے ہوئے سپاہی
سرسبز پہاڑیوں میں مبدل ہو جاتے ہیں۔ ہوا میں ایک جاں بخش خنکی سی محسوس ہوتی ہے
اور پھیکے، بد ذائقہ کنوؤں کے پانی کے بجائے قدرتی چشموں کا آب شیریں ملتا ہے۔ یہاں
پہنچ کر پچھلے سفر کی سب کلفتیں دور ہو گئیں۔

ایک دن آرام کرنے کے بعد کوٹلی سے چکر سٹہرہ پہنچے جو کوٹلی سے کوئی پندرہ میل
میل کے فاصلے پر ہے۔ سٹہرہ سے ریاست پونچھ کی عملداری شروع ہوتی ہے۔ اسکا پہلا
ثبوت جو ہمیں ملا وہ پونچھ کسٹرنیڈس تھا۔ جوٹرک کے کنارے کشمیر کسٹرنیڈس۔

سے ملتی تھی۔ چونکہ دونوں جگہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا، لہذا ہم
نے دونوں جگہ محصول ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

کشمیری نژاد انسپکٹر کسٹرنیڈ نے نہایت شریفانہ لہجہ میں کہا: ”آپ کے پاس چند اشیاء تو
ضرور ایسی ہوں گی جن پر ہمیں مجبوراً محصول لینا ہوگا۔“

قربان علی نے ڈپٹ کر پوچھا: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

پونچھ کے نوجوان وٹکیل محالدار نے منہ بناتے ہوئے ایک زرا لے انداز میں کہا: ”تو صاحب
آپ کے پاس قابل محصول کونسی اشیاء ہیں۔“

قربان علی نے بھی اسی طرح منہ بناتے ہوئے ایسے انداز میں کہا: ”اے میرے قربان
حال۔ ماہ ادھر غر منقولہ۔“

جاؤں" صاحب! ہمیں تو آپ کے سر کی قسم جو ہمارے پاس کوئی ایسی شے ہو۔ آپ کے سر کی قسم آپ کے حسنِ صبیح کی قسم آپ کے ..."

حسین محالدار نے ڈانٹ کر کہا: "چپ رہو جی۔"

اس مزاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا سب سامان کھول کھول کر اچھی طرح دیکھا گیا۔ بسترِ تہمید۔ چھو لدری، تہنوں کی بوریاں، ایک ایک چیز کو بغور دیکھا گیا۔ آخر کار بڑی کاوش و محنت کے بعد محالدار صاحب کو ایک بستر میں لپٹا ہوا ایک پورٹیل گراموفون ملا۔ اور ایک ڈائلن۔ محالدار صاحب نے آخری چیز کو چھو کر پوچھا: "یہ سارنگی ہے؟"

قربان علی نے نہایت شیریں لہجہ میں جواب دیا: "نہیں دلربا!"

پونچھ کے محالدار صاحب نے غصہ سے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! اگر آپ گالیاں دینے پر اتر آتے ہیں تو مجھے بھی مجبوراً آپ کو پولیس کے حوالہ کرنا پڑے گا۔" میں کہتا ہوں "قربان نے تیز ہو کر کہا: "یہ (ڈائلن کو ہاتھ لگا کر) دلربا ہے۔ آپ نہیں بخدا! آپ کو اپنی ذات سے کس قدر حسنِ ظن ہے۔ یہ سارنہ ہے جسے آپ اپنی دانست میں سارنگی سمجھ بیٹھے ہیں۔ بس کا نام "دلربا" ہے۔ سمجھے آپ؟ اب آپ شوق سے پولیس کو بلائیے۔ اور میں کہتا ہوں "یہ کہہ کر قربان ادھر ادھر دیکھنے لگا گویا کسی پاگل خانے کے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر قربان ادھر ادھر دیکھنے لگا گویا کسی پاگل خانے کے ڈاکٹر کو ڈھونڈ رہا ہو، ہم سب تہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

کسٹم آفیسر صاحب جھینپے تو سہی مگر حقے آخر کسٹم کے انسر جھٹ بات کا رخ بدلا۔ گراموفون کی طرف اشارہ کر کے بولے: "اور صاحب! یہ کیا ہے؟"

جگدیش نے گراموفون کو آگے بڑھا کر کہا: "جناب یہ ٹائپ رائٹر نہیں ہے بلکہ پورٹبل گراموفون ہے، کو لمبیا کمپنی کا بنا ہوا، اس کے اندر ایک درجن ریکارڈ بھی بند ہیں۔ اگر جان کی امان پاؤں تو ابھی چند ریکارڈ آپ کے سامنے بجاؤں بعض ریکارڈ تو بہت ہی دلکش ہیں۔ خاص کر مس دلاری کا وہ کیف اور گیت۔"

رات دن چونگی میں میچا رہتا ہے

اپنے پہلو میں دبائے دردِ دل

محالہ صاحب آخر انسان تھے ہنس پڑے اور ایک دفعہ جو سنے تو پھر خوب کھل کر ہنسے ہمارے اور ان کے قہقہوں نے پونچھ کٹم ہاؤس کے کونے کونے کو۔ بہت سے لبریز کر دیا، اب چونگی کا ہر فرد بشر شاواں و فرحان نظر آ رہا تھا اور لدا و کشمیری انسپکٹر صاحب بھی اپنا کام چھوڑ ہمارے قہقہوں میں شریک ہو گئے اور اس طرح سب غم و غصہ گرد و غبار کی طرح دلوں سے دھیل گیا۔ چنانچہ شام کو کشمیری انسپکٹر صاحب نے ہمیں چائے پلائی۔ وہ چائے جو صرف اہل کشمیر ہی بنا جانتے ہیں اور رات کو ہم نے پونچھی محالہ صاحب اور کشمیری انسپکٹر صاحب کھانا دونوں کو شریک طعام کیا۔ خاصی رات گئے تک گلخوپ اڑاتے رہے، ولربا جی اور جگدیش نے "دردِ دل" کوئی چھ سات بار بجا یا خوب لطف رہا۔

دوسرے دن شہر سے جو چلے تو شام کو شہر پونچھ پہنچ گئے۔ ابھی ہم شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھے کہ ہمیں ریاست پونچھ کا یہ چھوٹا سا خوبصورت یہ تخت خوشنما باغات سے گھرا ہوا نظر آیا، سامنے سرسبز اور اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک حسین وادی تھی۔ جس کے

بچوں پنج دریائے پونچھ کا نیلا پانی پتھروں پر شور مچاتا ہوا گزر رہا تھا۔ دوزنک دھان کے وسیع کھیت پانی سے لمبا لب بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مرغابیوں کے خوشنما پر ہوا کے دوش پر پھیلے ہوئے تھے اور غروب آفتاب کی ارغوانی کرنوں میں پونچھ کا تاریخی تسلیہ ایک اونچے ٹیلے پر شہر کی باقی سب عمارات سے اوپر اٹھا ہوا، ایک نر شے تر شائے سیرے کی طرح چمک رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا: "نہایت حسین منظر ہے۔"

اوتار سنگھ کے نازک لب کانپے جس طرح پھول کی پتیاں ہوا میں کانپتی ہیں مگر وہ کچھ نہ بول سکا۔ ہم چلتے چلتے صدم بکرم ہو کر کھڑے ہو گئے۔ قدرت کے غیر فانی مصوٰ نے اپنی آرٹ گیلری کی بے پناہ دستوں میں سے ایک تصویر یہاں سامنے پیش کر دی تھی جس نے ہمیں مسحور کر دیا۔

کتنی ہی دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد ہم وہاں سے چلے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے منظر کو دیکھتے ہوئے اور اپنے دلوں میں انسان کی کم مائیگی و بیچارگی کا احساس لئے ہوئے رفتہ رفتہ سڑک اب ڈھلوان ہوئی جا رہی تھی اور نیچے اترتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی دادی کی طرف چلی گئی تھی آہستہ آہستہ ہم ایک نالے کے قریب پہنچے جس پر نیلے پتھروں کا ایک چھوٹا سا بل بنا ہوا تھا۔ پل کے پار چنار کے دو درخت کھڑے تھے۔ اب شہر بالکل نزدیک آ گیا تھا۔ چھوٹا سا خوبصورت شہر جو سامنے بہتے ہوئے دریا کے باہر واقع تھا شفق کی ارغوانی روشنی رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی اور شہر کی کھلی ہوئی کھڑکیوں اور درختوں کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں میں بجلی کے قمقمے ٹمٹماتے ہوئے سڑکوں کی طرح چمک رہے تھے۔

آہستہ آہستہ ہم دریا پر پہنچے، دو کشتہ مریجوں کے درمیان، دو آہنی رسول کے سہارے
ایک لکڑی کا پل لٹکا رہا تھا جو سارے قدم پڑتے ہی ڈولنے لگا۔ جب ہم پل کے درمیان پہنچے
تو یہ حالت تھی کہ پل کسی ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح ڈالوانڈول ہو رہا تھا اور ہم بدست شرابیوں
کی طرح لڑکھڑاہے تھے، چپکے لوں پر چپکولے آ رہے تھے اور شاید نیچے بہتے ہوئے دریا کی
پُرسور لہریں ابھرا ابھڑ کر پیاری پیاری لوریاں سنارہی تھیں۔ گورنمنٹ کو جو ترنگ آئی تو پل کے
درمیان کھڑا ہو کر گانے لگا۔ وہی سہنگل کا دلکش گیت :-

جھولنا جھولنا ڈری - جھولنا جھولنا

امبو کی ڈالی پر کوئل بولے - کوئل بولے

کوک کوک - جیا آوے - جھولنا جھولنا ڈری

رات کا وقت، وہ جانفروز نغمہ، دریا کی مضطرب لہریں، پل کا جھولنا۔ اس وقت
کی یاد دہنوں سہارے دل میں رہے گی۔

شہر پونچھ کی آبادی تقریباً دس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ ریاست پونچھ کا صدر مقام
ہے۔ اس کا اصلی نام "پنتس" تھا۔ راجہ پنتس کے نام پر رکھا گیا۔ بعد میں بگڑ کر پونچھ رہ گیا
اور اب اسی نام سے مشہور ہے۔ تاریخی حیثیت سے بھی وادی پونچھ کافی اہمیت رکھتی ہے
بیرون سانگ مشہور چنی سیاح کے سفر نامہ میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ میون سانگ نے ناص کر
آدی سومرن کے مضبوط قلعوں کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ وادی شہر پونچھ سے دس میل

کے فاصلے پر ہے لیکن اب ان قلعوں کا نام و نشان بھی مشکل سے ملتا ہے صرف کہیں کہیں چند کھنڈر باقی ہیں جو اپنی گزشتہ عظمت کی یاد میں سرنگوں ہیں مغلوں کے عہد میں شاہان مغلیہ خصوصاً جہانگیر بادشاہ اسی راستہ سے کشمیر جایا کرتے تھے۔ مابعد کھنڈوں کے عروج کے وقت بھی یہ خطہ کافی مشہور رہا چنانچہ سکھوں کے کئی بزرگ بھائی میلہ سنگھ، راجا سنگھ، بندہ بیراگی اسی خاک کی پیداوار ہیں۔
شہر پونچھ کا قلعہ قابل دید عمارت ہے۔ یہ مغلوں اور راجپوتوں کے زمانے کی یادگار ہے۔ یہ شہر کے جنوب مغرب میں دریا کے قریب ایک اونچی جگہ پر بنا ہوا ہے۔ قلعہ کا عقبنی منظر بہت شاندار ہے لیکن اس کا شرعی حصہ جو حال ہی میں گر کر دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے، چنداں دیدہ زیب نہیں اور اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ باقی حصوں کی کھنگی و بچنگی کے مقابلہ میں ایک نہایت بھونڈا مذاق پیش کرتی ہے۔

قلعہ کے قریب ہی فوارہ باغ ہے جو نشاط باغ سرنگیر کا ایک ہلکا سا نفیس چہرہ ہے اس باغ کی ڈیوڑھی ایک اونچی محراب دار عمارت ہے جس پر جا بجا ہندو دیوتیوں اور دیوتاؤں کے رنگین بت بنے ہیں۔ ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوتے ہی فوارہ باغ کی وسیع درمیانی روش نظر آتی ہے۔ جس پر بھجری کچھی ہے اور جس کے دورویہ بلند و بالا سرو کے درخت کھڑے ہیں۔ یہ روش باغ کو ٹھیک دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی زنانہ پارک کی طرف جاتی ہے۔ جو باغ کی زیریں منزل میں جنوب کی طرف واقع ہے۔ بالائی منزل میں ٹینس کورٹ اور حکام اعلیٰ کا کلب ہے۔ یہ باغ بہت وسیع و پر فضا ہے۔ شام کو لوگ باگ اکثر سیر کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں وہاں پر شادابی و غیر کے درختوں کے نیچے گھاس کے سبز غنابیں

بچوں پر گندراج اور گلاب کی چھکی ہوتی عطر نیز ٹہنیوں کے قریب پانی اچھالتے ہوتے
 فواروں کے پاس بیٹھ کر قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رانی صاحبہ
 اٹلیا کا خوشنما قصر اور موجودہ والی ریاست کا موتی محل بھی قابل دید عمارات ہیں۔ موتی محل
 مغربی طرز تعمیر کا مظہر ہے۔ یہ انگریزی دیہاتی طرز پر بنایا ہوا ہے اور نارمن اور گائیک
 طرز تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔

پونچھ میں تین روز ہے اور خوب سیر کی یہ صاف ستھرا، بانکا شہر ہے۔ گلیاں عموماً
 بکی ہیں اور گندے پانی کے نکاس کا بھی اچھا انتظام ہے۔ ہم یہ صفائی دیکھ کر بہت خوش تھے
 چاچو نے خواہش ظاہر کی کہ کاش سری نگر بھی ایسا ہی صاف ستھرا شہر بن جائے
 اوتار سنگھ نے کہا: تمہاری خواہش بالکل فضول ہے اور نہ صرف فضول اور نگمی ہی ہے بلکہ
 اس سے نقص امن کا بھی اندیشہ ہے اور ایک عالمگیر جنگ چھڑ جانے کا احتمال ہے۔
 چاچو بے چارہ حیران ہو گیا۔ کہنے لگا: وہ کیسے؟

اوتار سنگھ نے جواب دیا: نہایت سیدھی بات ہے۔ اگر خدا نخواستہ سری نگر صاف ستھرا شہر
 بن جائے تو پھر بھلا سوٹر لینڈ کون جائے اور اگر سوٹر لینڈ کوئی نہ جائے تو پھر سوٹر لینڈ
 کہاں سے کھلے اور سری نگر کے مقبول عام ہرنے پر کیوں نہ ہندوستان و سوٹر لینڈ میں
 جنگ چھڑ جائے؟ ٹھیک ہے، کیا تم نے مغربی اقوام کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے؟
 جنگ پیش نہ کرنا ہوتا تھا کیا واسطے؟ اور پھر لفظ محال اگر ہم سب کچھ

صبح بھی ہو تو پھر بھی جنگ کا چھڑنا ناممکن ہے کیا تم نے آج کا اخبار نہیں پڑھا؟
گورنمنٹ نے اچانک چلا کر کہا۔ اخبار؟ اخبار؟ اے آج کا اخبار کدھسک رہا ہے
آج صبح ہی اس میں ایک منحوس خبر پڑھی ہے۔

قربان علی نے جہاں لے کر پوچھا۔ کیا ہوا؟ کیا مسولینی نے خودکشی کر لی؟
گورنمنٹ نے جلدی سے کہا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے تم کتنے گدھے ہو۔
کچھ چین نے نہایت سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ تنہا اے سمیت سات!
ہم سب تہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

گورنمنٹ غصہ سے لال پیلا ہو کر بولا۔ اب تو تم ہنستے ہو، لیکن ذرا آج کا اخبار تو اچھی طرح
دیکھ لو۔ سری نگر میں بیضہ پھیل گیا ہے! سنا تم نے؟ اب خوب ہنسنا ہی ہی ہی!
ہم سب چلا کر کہا۔ اے بیضہ!

جگدیش نے خیر کے ایک کونے سے اخبار اٹھایا، ریاست جموں و کشمیر کا کالم پڑھا گیا۔
واقعی سری نگر میں وبا کی بیضہ پھیل گیا تھا۔ سیاح واپس جا رہے تھے۔
گورنمنٹ نے تجویز پیش کی۔ میرے خیال میں اب سری نگر جانے کا خیال دل سے نکال

دینا چاہئے۔

قربان نے کانپ کر قرار داد کی ان الفاظ میں تائید کی۔ بالکل درست۔ بیچارے گورنمنٹ
ابھی ابھی کنوارے سے "بیاہا" بنا ہے۔ اس کی امید دل کا خون نہ کیا جائے۔
نگہ چین نے زوردار الفاظ میں کہا۔ اور میں بیضہ کی موت نہیں مرنے چاہتا۔ یہ کچھ خلاف

تہذیب سی موت ہے۔

چاچو نے تجویز پیش کی کہ تو بہتر یہ ہوگا کہ اگر ہم سرنگ نہ ہیں جاسکتے تو ذرا بہرام گلہ تک ہی ہو آئیں۔ کافی ٹھنڈی جگہ ہے۔ سطح بحر سے کوئی نو ہزار فٹ بلند اور مشہور تاریخی مقام ہے کہیں؟ یہ کہہ کر چاچو ہم سب کی طرف فائن خانہ انداز سے دیکھنے لگا۔ گویا کہہ رہا تھا دیکھا ایسی نادریجور سوائے میرے اور کسی کے دماغ میں نہ آسکتی تھی؟

نسبے اس معقول تجویز پر صاف کیا اور ہم دوسرے روز بہرام گلہ کو روانہ ہو گئے۔

اُس دن میلے پکیلے بادل آسمان پر چھپائے ہوئے تھے۔ ہم نے احتیاطاً دو اچھے مضبوط مزدور اپنے ہمراہ لے گئے تاکہ راستہ میں آبلے طوفانی نالوں کو عبور کرنے میں مدد دے سکیں، ابھی ہم کوئی دو کوس ہی گئے ہوں گے کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ زور کا جھکڑ چلنے لگا۔ مطلع تاریک ہو گیا اور پھر چند لمحوں میں کالی کالی گھٹاؤں نے بے طرح برسنا شروع کر دیا۔ راستہ میں جگہ جگہ پھسل تھی اور جگدیش کی نشاوری چیل جس کی وہ تمام راستے میں تعریفیں کرتا آیا تھا۔ اب یہاں اُسے بار بار دھوکا دے جاتی تھی اور وہ بیچارہ اکثر جگہ دھڑام سے گر پڑتا تھا۔ پہلی بار جب وہ گرا تو ہم سب نے لمبا سا منہ بنا کر اس حادثہ پر افسوس ظاہر کیا۔ لیکن جب رنج سے خود گھبرا اُنساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ اب جبکہ جگدیش بار بار گرنے لگا تو یہ افسوس جلد ہی قہقروں میں بدل گیا اور اب یہ حالت تھی کہ ہر دو فٹ لانگ چل لینے کے بعد ہم جگدیش کے گرنے کے منتظر رہتے اور کوئی تنگ سی پگڈنڈی بن کر سبز دھان کے کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی نظر آجاتی تو ہماری خوشی کا کوئی

ٹھکانہ نہ رہنا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ جگدیش کی نشادری چیل جس کی وہ راستے بھر میں تعزینیں کرتا آیا تھا، یہاں اُسے ان پانی سے بھرے ہوئے دھان کے کھیتوں میں ضرور اذہا گئے گی اور پھر کبھی ایسا ہونا کہ جگدیش گرنے گرنے چاچو، موہن لال، اوتار قربان یا ادو جو کوئی بھی اُس کے آگے یا پیچھے چل رہا ہوتا، اُس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا اور اس طرح اُسے بھی اپنے ہی ساتھ پانی میں دھکیل لے جاتا، غرضیکہ اسی طرح کچھ نہیں لت پت، بارش میں بھیکتے ہو گیلے میکناش اوڑھے ہوئے، گرتے ہوئے گرتے ہوئے، تین روز سفر کرتے رہے، راستے دشوار گزار تھے، تنگ اور ڈیرھی پگڈنڈیاں، دشوار گزار گھاٹیاں، طوفانی مالے، کئی جگہ تو راستہ ملتا ہی نہ تھا اور پھر طرہ یہ کہ بلا کی موسلا دھار بارش تھی اور آسمان کسی غریب کی ٹوٹی ہوئی چھت کی طرح ٹپک رہا تھا۔ ان تین دنوں میں ہم نے پھاگلہ، سوہرن، نقیاز تین جگہوں پر مقام کیا لیکن ان کس بلا کی سردی تھی بجلی کی چمک، بادل کی گرج، برنائی ہواؤں کے فراٹے، دریلے پونچھ کی پر شور دوانیاں اور گیلے بستر، ایسا معلوم ہوتا کہ یہ جولائی کا مہینہ نہیں بلکہ دسمبر کا مہینہ ہے۔

خدا خدا کر کے چوتھے دن آفتاب نے بادلوں سے منہ نکالا اور دھند میں لپٹے ہوئے سرسلیک پہاڑ اور سرسبز مرغزار ایک نئی شان سے پھر جلوہ افروز ہوئے، اوتار سنگھ کے نیلے ہونٹوں پر سرخی دوڑنے لگی اور گورکھ بخش کے خاموش گلے سے سریلی تانیں نکلتا شروع ہوئیں اسی دن کی حسین شام کو جبکہ آفتاب ماڑھ کی برنائی چوٹی پر غروب ہو رہا تھا اور جنگل کے وحشی آنکھوں والے نڈر گڈر سیسے ریوڑوں کو واپس گاؤں کی طرف لا رہے تھے۔ ہم مغلوں کے پرانے عشرت کدہ بہرام گلہ میں داخل ہوئے۔

”گلہ پہاڑی زبان میں ایک تنگ راستہ کا مفہوم ادا کرتا ہے، بہرام گلہ چاروں طرف
 اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں ایک پہاڑ کو کاٹ کوہہ راستہ
 بنایا گیا تھا جس راستہ سے شاہان مغلیہ کشمیر جایا کرتے تھے، اس کو بہرامی نام انجینئر نے تعمیر
 کیا تھا اور اب یہ اسی انجینئر کے نام پر بہرام گلہ کہلاتا ہے۔ اس راستہ کا اب محض نشان ہی
 موجود ہے مغلوں کے زمانے کی شاہراہ اب ایک پگڈنڈی رہ گئی ہے جس پر اب کبھی کبھیں
 چراتے ہوئے گولے یا کوئی اکاؤٹا مسافر نظر آجاتا ہے جس پہاڑ کو کاٹ کر یہ راستہ بنایا گیا تھا
 اُس کے دامن میں ایک طوفانی نالہ بہتا ہے جس کا نیلا رنگ کی طرح ٹھنڈا پانی کا غان سے آتا
 ہے، کبھی اس کا غان کے نالے پر ایک سخت کم پل تھا۔ آج اُس کی جگہ چند کٹڑی کے ناترا شید
 کندول نے لے لی ہے جو پہلی برساتی بارش میں بہہ جاتے ہیں۔ کٹڑی کا ٹکڑا
 بہرام گلہ ایک تنگ گھٹی سمی جگہ پر واقع ہے جو کا غان اور چندی مڑھ کے نالوں کے
 درمیان ایک اونچی ٹیلی پر واقع ہے۔ اس کے شمال مشرق میں چندی مڑھ کی جانب سلسلہ
 کوہ بہت اونچا ہو گیا ہے اور متواتر برف و باراں سے بے ریش و برودت ہے سنگلاخ زمین
 اونچی چٹانیں قومی ہیکل دیووں کی طرح سر اٹھاتے ہوئے ہیں جن پر انسان کا قدم رکھنا
 ہر لحاظ سے جان کو خطرے میں ڈالتا ہے اور پھر یہاں سانپوں کی وہ بہتات ہے کہ تو یہی
 بھلی ہینکڑوں ہزاروں سانپ، ہر چٹان کے نیچے سانپ، ہر چٹان کے اوپر سانپ
 دھوپ سینکتے ہوئے، بل کھاتے ہوئے، پھینکاتے ہوئے، ایک عجیب میناک نظارہ ہوتا ہے جس
 یہاں ان ننگے اونچے، برناتی، سنگلاخ پہاڑوں پر صرف تین جاندار پائے جاتے ہیں۔ ایک تو
 یہی اشرف المخلوقات انسان ہے جو سو کم گرامیں یہاں کبھی نظر آجاتا ہے، بندوق اٹھا
 ہتھکڑیوں تک چرمی موزے پہنتے ہوئے شکار کی تلاش میں سرگرداں دوسرا جاندار یہی سب

ہے۔ جو اس اشرف المملوکات کا زلی دشمن ہے اور تیسرا جاندار ایک چوپایہ اس کا نام
 "مارخور" ہے کیونکہ یہ سانپ کھاتا ہے۔ مارخور ایک نایاب جانور ہے اور یہ چوپایہ ہمیشہ ان
 سرور، برافانی، دشوار گزار چٹانوں پر اپنا بسیرا کرتا ہے۔ یہ نہایت مضبوط جھاکش پھنڈلا
 جانور ہے۔ اس کے سر کی ہڈی اور سینک نہایت مضبوط ہوتے ہیں اور اکثر اسے سر کے
 بل سوٹ تک چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

مارخور کا شکار نہایت جان جو کھوں کا کام ہے۔ آج سے صدیوں پہلے ایک ایسے
 ہی شکار کو دیکھتے ہوئے ایک مغل بادشاہ کی جان گئی تھی۔ اُس دن مارخور دل کا شکار رہو ہاتھا
 اور دو پہر کے بعد چٹانوں کے بڑھتے ہوئے سایوں میں جہانگیر بادشاہ، ولی کالا، بانی شہزادہ
 سلیم نہیں بلکہ بوڑھا جہانگیر ایک چٹان پر بیٹھا ہوا مارخور دل کا شکار دیکھ رہا تھا، سامنے
 ایک شکاری بہت دیر سے ایک مارخور کے تعاقب میں تھا کبھی چٹانوں کے اوپر بڑا روت
 قدم رکھتا ہوا کبھی چٹانوں کی اوٹ میں چھپتا ہوا، سانپوں سے ڈرتا ہوا، بھونک بھونک کر
 قدم رکھتا ہوا، لیکن نہایت ہوشیاری سے چالاکی سے پھرتی سے وہ ہر لمحہ اپنے شکار کے
 قریب آ رہا تھا اور کس دلچسپی سے انہماک و شوق سے جہانگیر گردن بڑھائے بھٹے لب
 کھولے ہوئے اس انتظار میں تھا کہ کب شکاری شکار پر جھپٹتا ہے کہ اتنے میں دفعۃً شکاری
 ایک اونچی چٹان سے بھپلا، اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار اُپر اٹھ گئے، فاتحانہ ٹکا ہوں میں
 موت کی تار کی دوڑ گئی، امنہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور دوسرے لمحہ شکاری چار سوٹ
 نیچے ایک چٹان پر گر اور گرتے ہی پاش پاش ہو گیا۔

جہانگیر کے دل پر ایک نانا بل برداشت چوٹ لگی، اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کا دل
 دھمک کر منہ میں آگیا۔ جہانگیر نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے کھیل کو بند کرنے کا حکم دیا رات کو اسی صدمہ

اُسے بخار ہو گیا، شاہی حکماء نے بہتر علاج کیا، لیکن موت کا علاج اُن کے پاس نہ تھا۔
 چنانچہ پانچ چھ روز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد مغلیہ خاندان کا یہ روشن تارہ ٹوٹ کر قضا
 بسط میں گم ہو گیا۔ وہ لاؤ شکر، وہ گما گھی، وہ نواب امیرزائے عربی گھوڑے خواجہ سرا
 حسین کنیزیں، راجپوت جرنیل، کسی کو کانوں کاں خبر تک نہ ہوئی۔ صرف ملکہ نور جہاں اور تین
 چار مختبر افراد اس حادثہ سے باخبر تھے۔ مشہور کردیا گیا کہ بادشاہ کی طبیعت بدستور نا سانیہ
 اسی حالت میں زیرک ملکہ لبوں پر سکراہٹ مگر دل میں خون کے آنسو روتی ہوئی لاہور پہنچی
 آگے جو کچھ ہوا وہ سب دنیا جانتی ہے۔

بہرام گاہ میں ہم سات روز رہے لیکن کبھی بھول کر بھی چندی مٹھ کے خونیں پہاڑ پر نہ گئے
 ہاں ہم چندی مٹھ کے چھوٹے سے قصبہ میں پرانی مغلیہ سرائے دیکھنے ضرور گئے۔ وہ کسی زمانے
 میں نہایت شاندار سرائے ہو گی۔ لیکن جب ہم نے اُسے دیکھا تو بالکل خستہ حالت میں تھی۔
 جن کمروں میں کبھی نواب اور راجے ہمارے آکر اتر کرتے تھے۔ وہاں آج چوہے دوڑ رہے
 تھے اور زمانے کے انقلاب پر زبان حال سے زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ اکثر کمروں
 پر پہاڑی لوگوں نے قبضہ جما رکھا تھا اور گھر بنا کر رہتے تھے چنانچہ جن صطبلوں میں کبھی عربی
 گھوڑے پہناتے تھے۔ وہاں آج بھینسیں جگالی کر رہی تھیں اور بھیتوں اور منڈیروں پر
 اگی ہوئی گھاس نہایت موثر لہجہ میں حکمتہ آشارتندہ کو دعوت عمل دے رہی تھی۔

یہاں کے لوگ نہایت غریب، نیکسل اور جفاکش ہیں۔ صرف موسم گرما میں یہاں رہتے
 ہیں اور اپنی زمینوں میں کاشت کرتے ہیں۔ یہاں سال بھر میں صرف ایک فصل ہوتی ہے
 موسم سرما میں یہ لوگ بال بچوں سمیت نیچے گرم علاقوں میں اتر جاتے ہیں اور مزدوری کے اپنا

پیٹ پاتے ہیں تاریخ کا اثر دیکھئے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان لوگوں میں نورجہاں اور جہانگیر نام رکھنے والوں کی کتر ہے، ہر گھر میں کم از کم ایک نورجہاں اور ایک جہانگیر ضرور موجود ہے کئی بار مرکب ناموں میں ان دو ہستیوں کا نام آجاتا ہے مثلاً نورجہاں فاطمہ جہانگیر شیر علی خاں اور ایسے کئی عجیب عجیب نام سننے میں آتے ہیں۔ بالعموم ہر کاڈل کے فرد کو جہانگیر کہا جاتا ہے اور حسین عورت نورجہاں کے نام سے پکاری جاتی ہے چند ہی طرح کی سرائے دیکھ کر واپس آتے ہوئے ہمارے پہاڑی رہبر نے پہلا راستہ چھوڑ دیا یعنی جس راستے سے ہم سرائے دیکھنے گئے تھے اور ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جو ایک تنگ سی بگڑی ہوئی کی صورت میں ڈھلوان ہو کر آخر چند ہی مرحلوں کے نانے میں ختم ہو جاتا تھا۔ راستے میں میں نے رہبر سے سوال کیا۔

”تم اب نہیں کہہ رہے ہو؟“

”کچھ دکھانے کے لئے!“

”وہ کیا؟ کوئی شکستہ مزار یا فرسودہ قلعہ؟“

اوتار سنگھ نے ناک چڑھا کر کہا: تمہاری مراد شاید کسی عورت سے ہے۔ اگر

ایسا ہو تو (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) میں باز آیا۔“

قربان سبکدینہ کہنے لگا: اوتار! تمہیں کیوں دجینی منافرت پھیلانے کے جرم میں گلے پانی بھج دیا

جائے۔“

اوتار سنگھ بولا: ”تو کیا کالے پانی میں خودتیں نہیں ہیں، بخدا اگر ایسا ہو تو میں آج

کو تک مار چ کرنے کو تیار ہوں۔“

ہمارا رہبر کہنے لگا: صاحب! آپ کو کالے پانی جانے کی ضرورت نہیں جو چیزیں اب آپ کو دکھانے والا ہو

وہ حقیقت میں خود بھی نہایت خوبصورت ہے اور ایک خوبصورت عورت کے مام سے وابستہ ہے۔
اس پر ہم سب چپ ہو گئے۔

اب ہم نالے میں چل رہے تھے کبھی باہی میں سے گزرتے ہوئے کبھی پتھروں کو بھانڈتے ہوئے
نالے کے دونوں طرف نہایت دلآویز ہر پاول تھی جو آنکھوں کو نہایت بھی معلوم ہوتی تھی۔
ٹنگ بنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے جن کی تہک سے ساری ہوا معطر تھی سنبیلو اور رس بھری
کی جھاڑیاں پھلوں سے لدی چھندی تھیں۔ چلتے چلتے ہم کسی پھلدار جھاڑی کے پاس ٹھہر جاتے
اوجھکی ہوئی شاخوں سے پکے ہوئے سنبیلو اور سرخ سرخ رس بھریاں توڑ توڑ کر کھاتے، کہیں
شمشاد کے نازک بوٹے کھڑے تھے، تو کہیں اخروٹ کے قندار درخت لائے لائے ڈال
پھیلاتے ہوئے سایہ کر رہے تھے اور ان پر جنگلی پرند بیٹھے تھے جنگلی طوطے، لکڑا رت گلے
سنبھلے جن کے پر تیزیوں کی طرح رنگین تھے اور جن کی بولیاں بیل کے نعموں کی طرح دلنواز
تھیں کبھی کوئی پرندہ پر پھیلائے گو گو کرتا۔ تو س قزح کی طرح چمکتا ہوا سامنے سے
گزر جاتا اور آنکھوں کو روشن کر جاتا۔ کبھی کوئی صدیوں کے پرانے شاہ بلوط کا گھٹا
چھتھنارا سامنے آ جاتا جس کے خوشگوار سائے میں نوجوان چرواہے نہیں اور چرواہے ریوڑوں
کو ساتھ لئے ہوئے اگلے ہوئے، الغوزے بجاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اسی طرح چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے، ہم ایک
پل کے قریب پہنچے ہونالے کو عبور کرنے کے لئے دو دیوار کے درختوں کو گر کر بنایا گیا۔ پیل
ایک تنگ موڑ پر تھا جس سے آگے آنیوالی جگہ ہم سے پوشیدہ ہو گئی تھی۔
ہمارے رہبر نے کہا: یہی وہ جگہ ہے۔ ذرا کان لگا کر سنئے!

ایک مدھم سا شور جیسے دور ہزاروں آدمیوں کے مجمع سے پیدا ہوتا ہے سنا دیا۔ ہم

اشتقاق میں جلدی سے آگے بڑھے اور تیز تیز قدموں سے موڑ کاٹ کر پل عبور کیا۔

بحان اللہ!

کتنا خوبصورت آتشا تھا۔ کوئی چار سو فٹ اونچا، پہاڑ کی چوٹی پر سے دو چٹانوں کو چیر کر نکلتا تھا اور پھر کوئی دو سو فٹ نیچے اتر کر ایک اٹھٹی ہوئی چٹان کی سیچھے گم ہو جاتا تھا اور پھر اسی چٹان کے قدموں سے لاکھوں پھنور بناتا ہوا نکلتا اور پھر وہ پڑ پڑ ٹپکتا ہوا شور مچاتا ہوا ایک نالے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ آتشا کے دونوں طرف جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی چٹانوں پر ہیں کہیں اونچے فدا اور درخت کھڑے تھے اور پانی کے چھوٹے چھوٹے لاکھوں موتیوں سے مزین تھے۔
میں نے آہستہ سے پوچھا۔ اس کا کیا نام ہے؟

”نوری چھنم!“ رہبر نے جواب دیا (THE FOLL OF LIGHT)

نور جہاں!

نوری چھنم! —

(THE LIGHT OF THE WORLD)

یہاں ہوا میں جاں نیش خنکی تھی اور ایک عجیب سی خوشبو، کچھ کچھ اوزون —
(OZONE) سے ملتی جلتی اور گوہر آتشا سے ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر تھے پھر بھی آتشا کی ہلکی ہلکی پھواریں پڑ پڑ رہی تھیں۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں لاکھوں گڑبڑوں، ان گنت فشنم کے حسین قطروں کی طرح درختوں کے پتوں پر جھاڑیوں کی جھکی ہوئی شاخوں پر بنفشہ کے شرمے ہوئے پھولوں پر پڑ رہی تھیں آتشا کے قریب ہی جہاں یہ نیچے چٹان میں غائب ہو رہا تھا، ایک خوشگوار ملکا سا دھواں اٹھ رہا تھا اور اس کے نیچے میں ایک دلکش قوس منج تنی تھی، مدھم اور رنگین، یہ قوس فوج ہر لمحہ ٹوٹ جاتی اور لچھڑے ٹوٹ کر نمی بن جاتی تھی، پہاڑ کی چوٹی پر سے لاکھوں ٹن پانی نیچے گر رہا تھا۔ رفتار میں نہایت تیز اور نہایت ہی آہستہ

مگر نہیں! — یہ تو محض ایک وہم تھا، سراب حقیقت ایک ایک اُس انروانی
جام نے چھاک کر آئینہ کی صورت اختیار کر لی، منہل بادشاہ اور حسین ملکہ کی تصویریں معاً لگا ہوں
کے سامنے سے ہٹ گئیں شاید ہوا کا وہی جھونکا، انہیں واپس اڑا کر لے گیا۔ جس نے آج
ایک دم کے لئے آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے کی تاریخ کے فرسودہ و رنگین ادنیٰ
اُلٹ دیئے تھے۔ اب پھر آنکھوں کے سامنے وہی آئینہ تھا، خوبصورت سببناک وحشی
دل پر ایک عجیب احساس طاری ہو گیا۔ قدرت کی جمالی کیفیتوں کے آگے انسانی حسن
کیس قدر پیچ ہے اور اُس کے پرہیزگیت شکوہ و جلال کے سامنے انسانی طاقت کیس قدر
پست نظر آتی ہے۔ پانی کے ان لاکھوں کروڑوں ٹوٹے ہوئے بلبوں میں بشریت کی
مکمل تاریخ موجود تھی اور قدرت کی ابدیت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی کم مائیگی
اور بچاؤ کی کا بھی اعتراف تھا۔ غالباً آج سے ہزاروں برس پہلے بھی آئینہ ہوگا۔ بالکل
اسی طرح حسین اسی طرح دلفریب۔ انسانی صدیاں اس کے چند لمحات ہیں اور انسانی
مسرتوں اور غموں کے مقابلہ میں اس کے پاس اپنی ابدی وحشیانہ ہنسی ہے!
پتہ نہیں میں کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا، پتہ نہیں میں کتنی دیر اور وہاں بیٹھا رہتا، اگر
ایک مدھم اور خفیف آواز مجھے اس روحانی خواب سے جگانے دیتی، جب میں ہوش میں آیا تو
چاندنی چھلکی ہوئی تھی اور آئینہ کا پانی ایک نورانی سیل بن کر گر رہا تھا، میرے سامنے
ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی، ادھر بری کمر، چہرے پر لافند اور جھیریاں، رون کی طرح سفید بال
اور خفیف آواز میں کہہ رہی تھی۔ بابا، ایک پیسہ، خدا کا واسطہ، ایک پیسہ۔
میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرے ساتھی پہلے ایک شیلے
پر بیٹھے تھے، چپ چاپ اور اکڑوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی مافوق الفطرت سحر سے

مسحور ہو گئے ہیں۔ سارا منظر انسانوں کی اور الف لیلوی تھا۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ ہم انسانوں کی سرزمین میں نہیں ہیں۔ بلکہ کسی جنوں یا پرلیوں کی دنیا میں آگئے ہیں۔ لیکن اُس بوڑھی عورت کی کمزور آواز نے پھر سوچ بکا دیا۔

”بابا ایک پیسہ خدا کے واسطے ایک پیسہ۔“

میں نے جلدی سے جیسے ایک پیسہ نکال کر اُسے دیا۔ وہ مجھے دعائیں دینے لگی
میں نے آبشار کی طرف دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا ”تم اُسے جانتی ہو؟“

اس نے آہستہ سے پراسرار طریق سے سر کو ایک اُتباتی جنبش دی

”اس کا کیا نام ہے؟ تم جانتی ہو؟“

اس نے رُک رُک کر کہا ”نوری... جھنم... نور... ری... جھنم“

شاید وہ کوئی مجھولا بسرا واقعتاً یاد کر رہی تھی۔

معاً مجھے کچھ یاد آگیا۔ میں نے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نورجہاں!“

یہ کہہ کر اُس آہستہ سے سر جھکایا اور کلڑی بیگنی ہوئی آگے چل پڑی۔ چاندنی
میں اس کے پریشان بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

مامتا

کوئی دوسرے کا وقت تھا، بادلوں کا ایک ہلکا سا غلاف چاند کو چھپاتے ہوئے تھا۔
 یکایک میری آنکھ کھل گئی کیا دکھتا ہوں کہ ساتھ کی چارپائی پر اماں سسکیاں لے رہی ہیں
 ”کیوں امی؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں ملتے ملتے پوچھا
 ”کیوں... امی! اماں نے سسکیوں اور ہنسیوں کے درمیان میرے سوال کو
 غصہ سے دہراتے ہوئے کہا: ”شرم نہیں آتی، باپ کو بھی اور بیٹے کو بھی۔ اتنے بڑے ہو گئے
 ہو۔ کچھ خدا کا بھی خوف نہیں۔“

”آخر ہوا کیا؟“ میں نے جلدی سے بات کا ٹکڑا پوچھا۔ یہ اُدھی رات کی وقت رونا کیسا؟
 ”گرمیوں کے دن تھے ہم سب آندے میں سو رہے تھے مگر آنا اندر سامنے ایک کمرے میں سو رہے تھے
 ان کی طبیعت ناساز تھی اور انہیں اکثر گرمیوں میں بھی سردی لگ جانے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے

اس لئے عموماً وہ اندر ہی سویا کرتے ہیں۔ آخر ان کی آنکھ بھی کھل گئی۔ وہیں بستر پر سے
 کروٹ بدل کر بولے: کیا بات ہے وجہ ہنہاری اماں کیوں زور رہی ہیں؟
 ”میں کیا بتاؤں آبا، بس زور رہی ہیں۔“

”ہاں اور تمہیں کس بات کی فکر ہے؟“ اماں کی ہچکیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔ ”بتہ نہیں میرا
 لال اس وقت کس حالت میں ہے میرا چھوٹا محمود، اور تم یہاں پڑے آرام سے سو رہے ہو۔
 وہاں اس کا کون ہے۔ نہ ماں، نہ بھائی، نہ بہن، اور تم یہاں غراٹے لے رہے ہو۔ آرام سے جیسے
 تمہیں کسی بات کی فکر ہی نہیں (کسکتے تھے) میں نے ابھی ابھی اپنے چھوٹے محمود کو خواب
 میں دیکھا ہے۔ وہ ایک میلے کچیلے بستر میں پڑا بخار سے تپ رہا تھا، اس کا پنڈا نور کی طرح
 گرم تھا۔ وہ کہتا ہے: ”اماں، اماں کہہ رہا تھا۔“ یہ کہہ کر اماں زور سے رونے لگیں۔

اماں کا ”چھوٹا محمود“ اور میرا بھائی لاہور ہی اے میں تعلیم پاتا تھا۔ تھوڑا دیر میں، میں
 ایف اے کا سالانہ امتحان دیکر لاہور سے یہاں مئی کے مہینے ہی میں آ گیا تھا، مگر محمود کو ابھی
 لاہور کی تپتی ہوئی فضاؤں میں پورا ایک ماہ اور گزارنا تھا۔ لیکن اب جون کا مہینہ بھی گزر گیا
 تھا اور محمود ابھی تک لاہور سے واپس نہ آیا تھا۔ اماں بہت پریشان تھیں اور سچ پوچھتے تو
 ہم سب بہت پریشان تھے۔ ہم نے کسے پرسوں ایک تاجر بھی دے دیا تھا اور مدتوں کے بعد
 اچانک کل ہی محمود کا خط آیا تھا چند مخفی سطور تھیں۔ لکھا تھا: ”میں بیمار ہوں۔ طیر یا کا
 بخار ہے۔ لیکن اب ٹوٹ رہا ہے۔ چند دنوں سے یہاں بہت بارش ہو رہی ہے۔ اگر
 لاہور کا یہ حال ہے تو اسلام آباد میں کیا ہوگا۔ کیا کشمیر آنے کا راستہ کھلا ہے جلدی لکھے
 کہ کس اتنے سے آؤں۔ کیا جوں با نہال روڈ سے آؤں۔“ کہہ کر وہ لالہ، اور ڈی ٹیک
 سے، کوئٹہ راستہ بہتر رہے گا؟ ہم نے سوچ بچار کے بعد ایک اور تاجر سے دیا تھا۔ گو بارش

بڑا دیر

بہت سہری تھی اور دونوں ٹکرکشیں کستہ حالت میں تھیں پھر بھی کوہالہ اوڑھی وڑ: بانہال روڈ سے
بہتر حالت میں تھی۔ اس لئے یہی مناسب تھا کہ محمود کوہالہ روڈ ہی سے آئے اب آدھی رات
کے وقت یہ افتاد آ پڑی۔

ابا کی نیند پریشان ہو گئی تھی چین جیسے ہوتے ہوئے بولے "تو اُس کا کیا کیا جائے؟"

اور تمہیں تو یونہی دل میں دوسرے سے اُٹھا کر لے ہیں بھلا اس کا علاج کیا ہے؟ آخر محمود
کوئی بچہ تو نہیں، تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ ہزاروں ماؤں کے لال لالہ پور پڑھتے ہیں اور ہوسٹو
میں رہتے ہیں۔ آتا ہی ہوگا۔ اگر آج صبح وہ لاہور سے چلا تو شام کو وہ راولپنڈی پہنچ گیا ہوگا
کل کوہالے اور۔۔۔"

اماں جلد ہی سے بولیں۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ کیا غضب کرتے ہو اور اگر خدا نہ کرے

اُس کا بچا راجھی نہ ٹوٹا ہوا پھر، میں پوچھتی ہوں تو پھر؟ یہ کہہ کر اماں رگ گئیں اور دوپٹے
سے آنسو پونچھ کر کہنے لگیں۔ مجھے موٹر منگو۔ وہ۔ میں ابھی لاہور جاؤں گی۔

"اب تم سے کون بحث کرے؟ میں تو نیند آئی ہے۔" یہ کہہ کر ابا کے ڈٹ بدل کر سوئے

میں نے بھی یہی مناسب جانکر آنکھیں بند کر لیں مگر کانوں میں اماں کی مدیم سسکیوں کی آواز۔ جسے

وہ دبانے کی بہت کوشش کر رہی تھیں، برابر آ رہی تھی۔ کیا دل ہے ماں کا اور کتنی غمیب ہے؟

اس کی؟ میں آنکھیں بند کئے ہوئے سوچنے لگا۔ ماں کا دل، ماں کی محبت، ماتا، کس قدر غمیب

جذبہ ہے۔ عالم جذبات میں اُس کی نظیر ملنی محال ہے۔ نہیں یہ تو اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک

سینے کے دھندلکے میں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھتی ہے اور چونک پڑتی ہے۔ لرز جاتی ہے۔ ماتا

... کیا اس جذبے کی اساس محض جسمانی ہے محض اس لئے کہ بیٹا ماں کے گوشت و پوست کا ایک

ٹکڑا ہے؟ اور کیا محض غم فانی کے تحمل کے مطالبی اس کائنات میں اکیلے ہیں، تنہائے یاد و دعا

ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے بھی نا آشنا، مگر میں بھی تو محمود کا بھائی ہوں، میری رگوں میں بھی وہی خون
 موجزن ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کے ان بدیں ساروں میں صرف
 دو دفعہ محمود سے جدا ہوا ہوں اور وہ بھی نہایت نلیل عرصوں کیلئے چھوٹے کیوں اس قدر اس کیلئے
 بیتاب و بے قرار نہیں مانتا۔۔۔ کیا ہم سچ محبتوں کے توفے کی طرح ہیں میرے کے میناؤں کی
 طرح خوبصورت لیکن بیجان اشوک کے کنبوں کی طرح سبق آموز لیکن سچیں بے روح و مانتا۔۔۔
 بدھ نے کہا تھا کہ یہ دنیا دھوکا ہے، سراب ہے، مایا ہے، ہوگی لیکن یقین نہیں پڑتا۔۔۔
 یہ جہنم جندہ کہاں سے آیا ہے اور کائنات کے ایک گوشے میں کسکتی ہوئی ماں کیا یہ بھی
 ایک دھوکا ہے بے سچ جانے یقین نہیں پڑتا۔

چھوٹا محمود۔۔۔ میرا ننھا محمود۔۔۔ میرا لال

اُمی ملی، چکیوں میں بھائی کا نام لے رہی تھیں کتنی معمولی سی بات تھی، بھائی جان نیا
 ابھی لاہور ہی میں ہونگے ضیافتیں اڑاتے ہوں گے، سیدنا دیکھتے ہوں گے، یا اگر لاہور سے چلے
 آئے ہوں تو راولپنڈی اس وقت خواب غمگوش میں پڑے خراٹے لے رہے ہوں گے۔ بلیریا
 کیا عجیب بلیریا کا بخار مطلق ہی نہ ہو۔ میں بھائی جان کے بہانوں کو فوجا جانتا ہوں، اماں بھی جانتی ہیں مگر پھر
 بھی رو رہی ہیں۔ آخر کیوں بے مانتا۔۔۔۔۔ شاید یہ کوئی روحانی قربت ہے، شاید اس دنیا کے وسیع
 صحرا میں ہم اکیلے نہیں ہیں، شاید ہم محض پتھروں کے ٹودوں کی طرح نہیں ہیں، شاید اس انسانی
 مٹی میں کسی ازلی آگ کے شعلوں کی تڑپ ہے، معنا مجھے مویا ساں کا افسانہ ”تن تنہا“ یاد آگیا
 جس میں اس نے اس شدید احساس تنہائی کا ردنا رو دیا ہے۔ آہ پیارا مویا ساں وہ ایک
 ماہر نفسیات تھا اور ایک ماہر نفسیات کی طرح وہ کئی بار نفسیاتی واردات کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہا جسے
 انکار کرنے کے لئے کتنے بڑے بڑے پشیمانیاں کیا یہی تنہا ایک ایسی ہی مثال ہے۔ وہ لکھنا ہے۔

قبر

وہ کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا، پہلے شاید موکہ کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ پھر حجب اس کا
 بڑا بھائی لاہور کے ایک بنک میں ملازم ہو گیا تو وہ بھی لاہور آ گیا، وہ سجد شرمیلا تھا۔ چھپرے
 بدن کا خوب رو جوان، فرخ پیشانی کھلتا ہوا رنگ متنہم ہونٹ، وہ ہونٹ جو ایک شرمیلی مسکرا
 کے باوجود ہر وقت کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر خستہ کرتے رہتے تھے، جماعت میں عموماً وہ
 پیچھے پنچول پر بیٹھا کرتا اور ہمیشہ ایک کونے میں، اُسے کسی نے کبھی جماعت میں کوئی شرارت
 کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ وہ لڑکیوں پر چاک پھینکتا تھا اور نہ ہی کاغذ کے ہوائی جہاز، اور
 تو اور اُس نے تو کبھی فاضل پروفیسر کی عمدہ تقریر کے دوران میں ایک پیسہ تک بھی بطور تحسین
 پروفیسر کی مدح پر نہ پھینکا تھا۔

اور پھر ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ شاہی ہے۔

کالج ہوسٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد مانوس ہو گئے تھے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ لائل پور کا رہنے والا ہے موضع ماموں کا بچن، وہ سات بھائی ہیں۔ ایک منیم، ایک دیل، ایک سکول ماسٹر، ایک آرٹسٹ، ایک بزاز، ایک انجین کا سرکاری ٹھیکیدار اور ساتواں اور سب سے چھوٹا وہ خود ایک طالب علم تھا۔ چھ بھائی تو بیسے جا چکے تھے اور اُن کی بیویاں اگرچہ کافی بد صورت تھیں۔ مگر "بھینر" کے معاملے میں بہت "حسین" واقع ہوئی تھیں اور اب اُس کی باری تھی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد —

شاید اسی امر نے اسے شاہ بنادیا تھا۔

موسم سرما کی چاندنی راتوں میں جب بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے، پریراؤں کی طرح آسمان میں اُڑ رہے ہوتے اور ملکی، نرم سپید چاندنی کا پرتو ہوسٹل کے کنگرول کو کسی پرشانی قلعے کے میناروں کی طرح پر اسرار حسین بنا دیتا۔ ہم دونوں ہوسٹل کی چھت پر کسی برج میں جا بیٹھتے، میں اُس سے پوچھتا۔

"سچ کہنا کیا تم نے کانن سے زیادہ خوبصورت اور با حیا لڑکی کہیں دیکھی ہے۔ خصوصاً جس دن وہ سپید ساری اور نفرتی آؤیزے پہنکر جماعت میں آتی ہے تو کسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ایمان سے کہنا کیا اُس وقت تمہارا دل یہ نہیں چاہتا کہ ایک ہلکا سا چاکلہ ٹکڑا اس طرح پھینکا جائے کہ اُس کے کانوں کے قریب اس کی سفید ساری کے دلفریب دھانپنے

سے چپوتا ہوا گویا اسے چومتا ہوا اگر چاہتے اور ایک چمپنی کے بھول کی طرح اس کے قدموں میں جا کرے۔ . . . ایمان سے، کلاس روم میں بیٹھے بٹھائے غراج حسن ادا کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ نیلا لال . . . اور پرنسپل اور پرنسپل کی بددقتی تو دیکھو کہ ہمیں اس قسم کی باتوں پر بھی جبر مانہ کرنے سے نہیں چوکتے اور بد معاش اور لنگھکے کے خطاب الگ بخشے جاتے ہیں۔ جی بچا ہوتا ہے۔ . . .

کنہیا لال ایک شعر گنگنانے لگا اور پھر اُس نے آہستہ آہستہ مدھم بھول میں اپنی داستانِ محبت کہہ ڈالی، شرمیلی پہلی محبت، جو ایک نوزائیدہ کلی کی طرح پتوں میں چھپی رہی۔ اس نے یہ داستانِ رگ رگ کہ بیان کی۔ اُس کے ہلکے مدھم لہجے میں وہ مدھم اُس اور صداقت ختمی جو اس پہاڑی گیت میں ہوتی ہے، اچھے جنگل کی ہواؤں نے کسی کسں چرواہے کے نازک لبوں سے پہلی مرتبہ سنا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں شرم اور علمی ختمی جو محبوب کی پہلی نگاہوں میں ہوتی ہے داستانِ شروع کرنے سے پیشتر اُس نے ایک بار سوئے مشرق دیکھا کہ اُس کی آنکھوں کی پتیلیاں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

”ہم سائے گھر میں پانی بھرنے کا کام ایک بیوہ بھینٹی کے سپرد ہے اُس کی ایک لڑکی ہے رکن“ اکتہیا لال نے رگ کہہ کر کہا۔ ”رکن کو تم نے نہیں دیکھا۔ اسی لئے کان کن کی دن رات تعریف کیا کرتے ہو، رکن کا ایک چچا ہے جس نے رکن کے باپ کے مرنے کے بعد اُس کی تمام جائداد قبضہ کر لیا ہے اور لڑکی اور بیوہ بھینٹی کو اس سے محروم رکھا ہے۔ اُس نے اپنے محروم بھائی کے مکان پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور رکن اور اس کی ماں کے لئے کوئی شہر نہیں ہے۔“

وے دی ہیں، ماں بیٹی دونوں بڑی مشکل سے دن کاٹ رہی ہیں اور دونین گھروں میں تین ماہیجی اور پانی وغیرہ بھرتی ہیں۔ ہمارے ہاں اُن کا آنا جانا بہت ہے۔ وہ بیچاریاں جب ہمارے گھر آکر میری بد صورت بھابیوں کو اپنے دکھڑے سناتی ہیں، تو انہیں بہت رگم آتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح یا شام کے وقت رکن کی ماں رکن کے چچا کی ایذا پرستی کی ایک نئی داستان سنارہی ہیں میرے چھ بڑے بھائی بھی اُن کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور رکن کی شینم فٹال آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہمدردی جتا رہے ہیں۔ اُن کا روتے سخن ہمیشہ رکن کی طرف ہے نہ کہ رکن کی ماں کی طرف، مثلاً بات تو کر رہی ہے رکن کی ماں، لیکن میرے بڑے بھائی جو سیٹھ رنجیتر لال جی کے ہاں منیم ہیں، رکن سے کہہ رہے ہیں۔

”اچھا رکن تو ہمارے ہاں چلی آہم یہاں تجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دینگے، ہے نا!“ اور پھر باقی پانچوں بھائی سر ہلا کر کہتے ہیں، ہاں، ہاں، ہاں، بھلا رکن کی ماں اور رکن تمہیں اپنے چچا کے ہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں آ جاؤ نا رکن!

انسانی ہمدردی کے اس شدید مظاہرے کے وقت میری بھابیوں کی صورتیں دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں، یا پھر کبھی بولیں تو تاکہ رکن ہمارے گھر ادا اس اور غریب صورت بنے آتی ہے اور پہلا بھائی۔ کیا بات ہے رکن؟

دوسرا بھائی۔ رکن، کیوں، کیا بات ہے؟

تیسرا بھائی۔ رکن ادا اس کیوں ہو؟ رکن؟

چوتھا بھائی۔ کیا کس نے تجھے کچھ کہا ہے؟

پانچویں بھائی کی باری آنے سے پہلے ہی رکن پھوٹ پھوٹ کر رٹنے لگتی اور سکیوں کے درمیان کہتی جاتی چچانے ماں کو آج پھر پیٹ ڈالا چچانے . . . چچانے ہوں . . . ہوں . . .

پانچویں بھائی نے گرج کر کہا: "چچانے مارا بہ . . . کیوں اُسے کیا حق ہے تمہاری ماں کو پیٹنے کا؟ وہ کہاں سے آیا سالا، حرافزادہ، شہداء کیوں جی بہ میں بچھتا ہوں اسے تمہاری ماں کو پیٹنے کا کیا حق ہے؟"

اور چھٹے بھائی ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر کہتے: "مکھوت آج ملارا ستے میں کہیں تو اس سے پوچھ لوں گا کہ ایک غریب بیوہ کو کس طرح تنایا جاتا ہے؟" پچھٹے بھائی کی لال لال آنکھیں دیکھ کر رکن ڈر جاتی اور آہستہ سے کہتی: "نہ نہ بھتیجا، تم کہیں انہیں مار نہ بیٹھنا . . . پھر تو آفت ہی آجائے گی۔"

اور چھٹے بھائی اسی آفت کے آجانے کے خیال سے چپ ہو رہتے، یوں بھی تو ہم ہیں کون اتنا دلیر تھا جو رکن کے چچا سے جا کر لڑتا، تو تو ایک بڑا ہی بدعاش اچھا ہوا، پرے درجے کا بطینت آدمی تھا، اس سے لڑائی مول لینے کو کون تیار تھا۔ یہ ہمدردی کا شدید جذبہ تو میرے بھائیوں کے دل میں محض اسی لئے بار بار طوفانی صورت اختیار کر لیتا تھا کہ رکن ایک نہایت ہی انجان، بھولی بھالی، معصوم اور بیحد خوبصورت دوشیزہ تھی اور میرے بھائیوں کی زیور باں بہت ہی چالاک، فریاد اندام اور بد صورت تھیں اور پھر انہیں آج تک اپنے متوسط طبقے کی معاشرت میں کہیں رکن کی سے باتیں کرنے اور اس کے ساتھ ہمدردی جانے کا

موقع نہ ملا تھا جب وہ بیچائے دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد تھکے ماندے گھر واپس آتے تو اکثر اپنی جاہل اور پھوٹے بیویوں کو بونہی چھوٹی چھوٹی نمکی باتوں پر پڑتے جھگڑتے دیکھتے۔ اس امر کا نفسیاتی ردِ عمل تم جانتے ہو ایک ہی صورت اختیار کر سکتا تھا۔

”عشق یا ہوس“ میں نے آہستہ سے پوچھا

”کچھ سمجھ لو“ کنہیا لال نے متین لہجہ میں جواب دیا: یہ ایک ہی جذبہ کے دو مختلف مدارج ہیں، میرے بھائیوں کو رکن سے باتیں کرنے میں سوزہ آتا تھا، اسے حاصل کرنے کے لئے اور اس کی لذت سے بہرہ ور ہونے کے لئے وہ مختلف طریق استعمال کرتے تھے، لیکن اگر ان تمام طریقوں کو اکٹھا کر کے انہیں جزئیاتی صورت میں دیکھنے سے احتراز کیا جائے اور بحیثیت مجموعی ان پر نظر ڈالی جائے تو وہ تمام طریقے ایک تسلسلہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مثلاً تمام بھائیوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے جذبہ ہوس کو ایک دوسرے سے چھپائے رکھیں۔

بہاں تک ہوس کے رکن سے اُس وقت بات کی جائے جب اور کوئی بھائی وہاں موجود نہ ہو۔

رکن پر اپنی ذاتی ہمدردی، خاندان کے دیگر اراکین سے الگ فخلگ ہو کر بتائی جائے۔
یہ ثابت کیا جائے کہ سچی ہمدردی صرف ”اسے“ ہو سکتی ہے اور باقی سب بھائی بونہی دکھاوے کے لئے باتیں بناتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ . . .

”اور تم؟“ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: ”تم ساتویں بھائی تھے اور غالباً بہت شریف...“

کنہیا لال شرماسا گیا، کہنے لگا، میں؟ تو اُسے دیکھتا ہی رہتا تھا کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ اُس کی بانیں سننا ہی رہتا، یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جاتی اور پاؤں کے انگوٹھے زمین کریدنے لگتی، میں تمہیں کیا بتاؤں، میں اُسے کس قدر چاہتا تھا، چاہتا ہوں۔ رکن کے آتے ہی میری حالت متغیر ہونے لگتی، خون کی دہائی تیز ہونے لگتی، طاقت گویائی سلب ہو جاتی، میں اُس سے بات کرنا چاہتا، لیکن نہ کر سکتا، بس ٹھنکی لگا کر اُس کی طرف دیکھتا رہتا، تمہیں کیا بتاؤں وہ کس قدر حسین ہے اور جب وہ مسکراتی ہے تو اُس کے لبوں کی داہنی طرف ایک نہایت دلفریب خم پڑتا ہے۔ جسے دیکھ کر میں اکثر دیوانہ ہو گیا ہوں۔

کنہیا لال رُک گیا، پھر ذرا ٹھہر کر بولا۔

پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں میں نے کئی بار سوچا کہ اگر اُسے رکن! رکن! میری جان رکن! یہ کہہ کر بلاؤں تو پھر کیا ہوگا، کیا وہ مجھے گالیاں تو نہ دے گی۔ کیا وہ اپنی ماں سے جا کر تو نہ کہے گی، اپنے بھائیوں اور بد صورت بھائیوں کا تو مجھے مطلق خوف نہ تھا۔ آخر میں نے نہایت کہ لیا کہ رکن سے بات کروں، میں نے دل میں سوچا کہ اس طرح خاموش محبت کرنے سے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ آخر ہو گا کیا، یہی نا، کہ وہ میری محبت ٹھکرا دیگی، میں اُس سے یہ کہو گا اور وہ مجھے یوں جواب دے گی، جس کے جواب میں میں اُسے یہ کہوں گا، اور وہ کہیں کہ مجھے تو ڈر لگتا ہے، اور میں کہوں گا کہ ڈر کیسا، رکن، جب وہ دل محبت کرنے پر تیار جائیں تو دنیا کی

کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی اور پھر وہ ایک شرمیلی ادا سے اپنے بازو میرے گلے میں
جھانک کر دے گی، اور میں بیباک بھری نگاہوں سے

ایک ایک ایک کھڑکا سا ہوا، میں چونک پڑا، سامنے دیکھا تو رکن کھڑی تھی، سر پر پانی کی گنگا
اٹھائے ہوئے، اُس کے ماتھے پر زلفیں بل کھائے بھیگی پڑی تھیں اور اُس کی لابی لابی
پلیکس بھی پانی کے قطروں سے جھجکی پڑی تھیں۔ بڑی مشکل سے انہیں اوپر اٹھا کر میری طرف
دیکھ کر کہا: "کاہن ذرا گرا کر تو اتر دادو"

میں میں کھڑا کھڑا کہا، آج کتنا اچھا موقع تھا، گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ نہ بھائی نہ بھابھائی کتے
بیاباں سب غائب تھے، کیسا عجیب اتفاق تھا میں ایک گہرائے ہوئے بطخ کے نیچے کی طرح رکن کی طرف دیکھنے لگا۔
"میں نے کہا کاہن (وہ مجھے کاہن کہا کرتی ہے) ذرا گرا کر تو اتر دادو، کھڑے کھڑے
کیا دیکھ رہے ہو"

میں نے گرا کر اتر دادی

رکن دالان کے ایک ستون کا سہارا لیکر کھڑی ہو گئی، وہ ہانپ رہی تھی۔ چہرہ لال
تھا۔ زلفیں لہرائی ہوئیں، کیا کر رہے ہو؟ رکن نے پوہنی پوچھا
"کچھ نہیں . . . کچھ نہیں" . . . میں نے ایک فحش کی طرح جواب دیا۔

وہ ہنسی پوہنی ایک دلکش ہنسی جیسے کسی مست زنا کے گھنگھروا ایک دم سوج اٹھیں۔
پھر وہ چپ ہو گئی اور چند لمحوں تک کامل خاموشی رہی۔

بھابیاباں کہاں ہیں؟ اب پھر رکن نے پوچھا اور اپنی جبین کے بال درست کرنے لگی

پنڈت جھگڑو رام کے ہاں کھتا ہے، وہاں گئی ہیں؟

اچھا! اُس نے اچھا! کچھ اس طرح مدھم اور رازدارانہ لہجہ میں کہا کہ میں نے سمجھا لیا
ہو اکا کوئی لطیف جھونکا نیم کے نیکیلے جھومروں میں نغمہ حیات پیدا کرتے ہوئے گزر گیا۔
پھر ٹھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنی کمر جھٹک دیا، اپنے شانوں کو جھٹکنے یا اپنی گردن
کو جھٹک دیا اور یہ سب کچھ بالکل غیر شعوری طریق پر ہوا، اس کے بعد اُس نے لاابالیا نہ انداز میں
کہا: اچھا کاہن میں چلتی ہوں۔

وہ چلی گئی۔

اے اے رکن! میرے رُمنہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ ڈیوڑھی سے لوٹ آئی یہ کیا کہتے ہو؟ اس کا چہرہ بالکل بھولا بھالا اور تہسم کے جذبات
سے عاری تھا۔

میری آنکھیں نیچی ہو گئیں، اور چہرہ بھی لال ہو گیا۔ کچھ نہیں، کچھ نہیں رکن۔ میں نے
آہستہ سے کہا۔

وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑی رہی اور میں اُس سے نگاہیں نہ ملا سکا۔ پھر میں نے دیکھا کہ
اس کے قدم آہستہ سے ڈیوڑھی کی طرف مڑ گئے۔

وہ جا رہی تھی۔

اے، یہ توقف، لگے سے اور جا رہی ہے۔

میں بھاگ کر ڈیوڑھی کی طرف گیا، وہ اس تنگ و تاریک ڈیوڑھی میں سے گزر رہی تھی۔

میں نے دوڑتے دوڑتے رُک جانا چاہا، لیکن میرے قدم مجھے اُس کے پاس لے ہی گئے، میں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا: رکن، رکن، میری بات سنو اور پیشتر اس کے کہ وہ میری بات سن سکتی۔ میں نے اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیئے۔

رکن کے بدن میں سر سے پاؤں تک ایک جھجھری سی آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو مجھ سے جدا کیا اور پھر ایک زور کا طمانچہ میرے مُنہ پر رسید کیا اور ایک زبردست لگاؤ ڈیڑھی سے باہر نکل گئی۔

میں رکن کے پیچھے بھاگتا ہوا گیا، یہ تو فوں کی طرح پیچھے بھاگ رہا تھا اور دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر اُس نے کسی سے کہہ دیا تو پھر رکن ذرا ٹھہر تو سہی، تجھے پر ماتما کی سوگند، رکن!

لیکن رکن روتی ہوئی، آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی آگے آگے بھاگی جا رہی تھی اور زور زور سے کہہ رہی تھی، ابھی ماں جی سے کہوں گی، ابھی چچا سے کہوں گی، ابھی چچا سے کہوں گی، ابھی تمہارے بڑے بھائیوں سے کہوں گی۔

کیا ہوا رکن، تو میری بات تو سن لے، تجھے دیوی کی سوگند اگر تو کسی سے کچھ کہے تجھے کانے مانا کی قسم۔

رکن ٹھہر گئی اور تشش باز لگا ہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی: ایسی خوشنمیں دیتے ہوئے تمہیں شرم تو نہیں آتی۔

اب ہم دوڑتے بھاگتے گئے، وہ نکل آئے، یہاں چپے چپے ٹھہرے اور

ایک تیلامیدان جس میں کہیں کہیں آگ کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، پرے ایک دختوں کا جھنڈ تھا اور اس کے نیچھے رکن کے چچا کا گھر اُس جھنڈ کی اوٹ میں سورج مغرب ہو رہا تھا اور کوئے کا تین کا تین کرتے ہوئے مغرب کو بھاگ رہے تھے، سورج کی شعاعوں میں اُن کے پُرسونے کے بنے ہوئے معلوم دیتے تھے، میسے سامنے رکن کمر پہ ہاتھ رکھے ایک عجیب شان دار بائی سے کھڑی تھی اُس کے آنچل کے تاروں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر مار رہی تھیں۔

”اب کبھی چھپر ڈوگے؟“ رکن نے ملائم لہجہ میں کہا

میں نے سر ہلا دیا۔ ”ہرگز نہیں۔“

وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی اور پاؤں سے ریت کرید کرید کر ایک محراب سی بنانے لگی۔ جب محراب بن گئی تو اُس نے آہستہ سے اپنا پاؤں محراب کے نیچے سے نکال لیا، اب ریت کی محراب تیار ہو چکی تھی۔ رکن نے فحمن نہ لگا ہوں سے میری طرف دیکھا

”یہ کیا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اُس سے پوچھا

”یہ تمہاری قبر ہے!“ رکن نے شوخی سے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

شریر لڑکی چیخ چیخ کر ہنس رہی تھی۔

”لاؤ ذرا دیکھیں تو۔“ میں نے اُسے پرے دھکیل کر کہا اور پھر لات مار کر ریت کی

محراب کو مسمار کر دیا۔

اوٹ اُس کی سنسنی فوراً بند ہو گئی۔ یہ تم نے کیا کر دیا (ہاتھ بڑھاکر)

لگاؤں ایک طمانچہ اور

میں نے سر جھکا کر کہا: "ضرور اب ایک نہیں ایک سوٹمانچے لگاؤ، اگر اُف
کر جاؤں تو کہنا!"

وہ گھر جانے کے لئے آہستہ سے مڑی اور ڈوبتے ہوئے سورج کے تپتے ہوئے
سنہری سیال نے یکایک اُس کے رُخ کو روشن کر دیا، اُس کی نگاہوں میں ایک عجیب
چمک تھی، جلتے جلتے اُس نے مدھم لہجہ میں کہا۔

"ہم گھر جا کر کہیں گے کہ کاہن، بڑا بدعاش ہے!
اتنا کہہ کر کنہیا لال رُک گیا۔

پھر وہ میں نے بے صبری سے پوچھا

. پھر کنہیا لال نے آہستہ سے کہا پھر گہری کی چھٹیاں ختم
ہو گئیں اور میں یہاں چپلا آیا۔

ہم دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ہوا کبھی کبھی جھونکے آ رہے تھے اور پرے
پیل کے درخت کی ایک ٹہنی میں چاند ایک ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح ٹمک گیا تھا، نیچے
سڑک پر ایک پوربیا گاڑی بیاں پتیم کیوں بھیرا اس پتیم کیوں بھیرا اس "گالتے ہوئے
بیل گاڑی چلاتا ہوا گزر رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد میں نے کنہیا لال سے پوچھا: "اور کمن!"

کنہیا لال مسکرا کر کہنے لگا: "میرے بھائی اپنی غلطیوں کا خمیازہ مجھے بھگتنے پر مجبور نہیں

کر سکتے، انہوں نے رو رہا تھا، انہیں رو رہا تھا، اب وہ اپنی بد صورت مہال بکھڑکڑاتے ہیں اور

چلتے ہیں کہ میری شادی بھی کسی موٹی، سانولی، مجید، گنوارن سے کر دی جائے، لیکن میں رومیہ نہیں
مسرت چاہتا ہوں، اور مسرت کا نام رکھنے سے، اور یہ بات رکن بھی اچھی طرح سے جانتی ہے۔
یہ بات ہے! میں نے سر ہلا کر کہا۔

ہاں!

بات ختم ہو گئی اور ہم دونوں برج پر سے اٹھ بیٹھے، لیکن نیچے سڑک پر گزر جاتے والے
کاڑھیان کے لئے بات ابھی پوری نہ ہوتی تھی، وہ ابھی تک گانا ہوا چلا جا رہا تھا۔ پتیم کیوں
بھیو اداس! پتیم کیوں بھیو اداس! !

میرے لئے کالج کی زندگی بہت جلد ختم ہو گئی، بہت سالوں کے بعد مجھے ایک دن
پچھر کنہیا لال ملا، میں لاہور بسلسلہ سیاحت آیا تھا۔ کہ سمس کے دن تھے اور نار کلی میں
بہت رونق تھی، پونہ ہی گھومتے گھومتے کنہیا لال مل گیا!

ارے!

میں نے اُسے بہت مشکل سے پہچانا۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ اب دھوئیں کی طرح
مبلا ہو گیا تھا جیہیں سنگن آلود تھی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، ہونٹ خشک اور چہرے پر چھپایا
جسم سوکھے ہوئے بانس کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایم اے انگریزی میں
اول رہا اور اب لاہور میں کسی کالج میں پروفیسر ہے۔

مگر تمہیں یاد کیا؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میرا سوال سن کر وہ آہستہ لیکن سیدھے لہجہ میں بولا: میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ معاشرت میں عورت کو باعزت طریق پر چل کر کرنا ناممکن ہے، یہاں شادیاں ہوتی ہیں لیکن محبت نہیں ہوتی، بہائے ماں باپ ہمیں سب کچھ معاف کر سکتے ہیں، ہمارے سب عجیب چھپا سکتے ہیں قتل، چوری، ڈاکہ، بددیانتی، لیکن وہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی اُن کی مرضی کے خلاف کسی لڑکی سے محبت کرنے کی جرات کرے، نتیجہ؟ نتیجہ تم کہو گے؟ نتیجہ صاف ظاہر ہے، رکن براہمنی تھی، اُسے ایک سو پچاس سال کا بوڑھا لیکن امیر رہا، ہمیں یاد کر لے گیا، میں بنیا تھا، میرے پلے ایک چڑچڑی گھگھیا بھگیا کرتا، کرنے والی بنیا میں باند دی گئی، بوڑھا براہمن چند مہینے ہوتے رام رام کرتا ہوا، اُس دنیا سے چل بسا اور اب کسں اور حسین رکن بیوہ ہے، ماں بھی بیوہ اور بیٹی بھی بیوہ، وہ اب میلے کپڑے پہنتی ہے اور جھکا کر چلتی ہے۔ جیسے اپنے بوڑھے خاوند کی موت کی ذمہ دار ہے۔

میں نے بات کا رخ پلٹا چاہا چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا: "سناؤ تمہارے بال بچے تو ہوں گے۔ راضی خوشی ہیں۔"

جیسے اُس نے میری بات کا غلط مطلب لے لیا، وہ ملامت باز لگا ہوں سے میری طرف دیکھ کر بولا: "بچے پیدا کرنے کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے، شادی ایک سودا ہے، دیگر اشیا کی طرح لڑکے لڑکیاں بھی سیم و زر کے انباروں کے عوض بیچے جاتے ہیں اور یہ طریق موجودہ نظام زندگی کے عین مطابق ہے اور بچے..." وہ ایک تلخ ہنسی نہ کر کے کہنے لگا: "بچے تو ایک کا بیٹا، شادی کا بزرگ بن گیا ہے اور پر ماتا

کاشکر ہے کہ ہندوستان میں ننانوے فی صدی شادیاں اس لحاظ سے کامیاب ہوتی ہیں تمہیں میرے بچوں کا حال سن کر حیرت نہ ہوگی، میں چھ بچوں کا باپ ہوں، رنگیتے ہوئے بچے، بسورتے ہوئے بچے، پیچیتے ہوئے بچے۔ اور میری طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھ کر بولا: اس میں میرا کیا قصور ہے پچیس چھیس سال کی جنسی ناتواستی کے بعد اگر ہندی نوجوان کی زندگی میں ایک عورت آجائے تو وہ کیوں نہ چوم چوم کر اس کا حلیہ بگاڑ دے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ عورت ہو کوئی عورت، ایک کافی عورت، انجی عورت، ایک عورت جس کی شکل نہارے کوٹھے کے پرنا سے بھی زیادہ حسین ہو، مگر وہ عورت ضرور ہو۔

اُس کا نس بھول گیا اور وہ کھانسنے لگا، کچھ مضائقہ نہیں، اب تھوڑے دن گئے ہیں، اب رات کو مجھے بخار بھی ہو جاتا ہے، کبھی کبھی کھانسی کے ساتھ خون کے قطرے بھی آجاتے ہیں، اب جلد ہی اس تیب سے چھوٹ جاؤں گا، لیکن مجھے اپنی نگرہ نہیں، مجھے نگرہ ہے تو صرف یہ کہ میں جتنا روز بروز دبلا ہوں، ہا ہوں میری بیوی اتنی ہی موٹی ہوتی جا رہی ہے۔

میں ہنسنا، بھائی کنہیا لال، معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغی توازن برقرار نہیں رہا، ذرا کسی پیار پر چلے جاؤ، جو ہونا تھا ہو چکا، خوش رہا کرو، دیکھو میاں کتنی چہل پہل ہے۔ یہ دل فریب ساریاں، بیفیکروں کے تھقبے، رومان اور خوشی۔

رومان اور خوشی، کنہیا لال نے جھنجھلا کر کہا۔ اُس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں اور پہلے سے بھی بد صورت نظر آنے لگا۔ تم ان لوگوں کی خوشی کا غلط اندازہ کر رہے ہو، یہ لوگ پیدا ہونے سے پہلے مر چکے ہیں۔ ان کا گلا نکلے ماں باپ نے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا۔

ہے، یہاں نہ رومان ہے نہ خوشی، یہ تو عیلتی پھرتی لاشیں ہیں لاشیں :-
 وہ رک گیا اور پھر تیری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ کر بلا اہم جانتے ہو جہاں
 رومان اور خوشی نہیں ہوتے وہاں کیا ہوتا ہے ؟ وہاں ہوتا ہے !
 مذہب، مذہب اور صرف مذہب، اب رکن مجھ سے بات تک نہیں کرتی، وہ دن رات
 مالا جیتی ہے اور اپنے آپ کو اور مجھے دونوں کو باپی سمجھتی ہے، ہا ہا ہا ہا !
 کنہیا لال زور زور سے ہنسنے لگا

کنہیا لال کی ہنسی نے بے اختیار میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیے، میرے سارے
 جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اور میرے جسم کے روئیں روئیں کو کانپنا ہوا چھوڑ گئی، پتہ نہیں
 کیوں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کنہیا لال کے پچکے ہرے گالوں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار
 وہ ریت کی قبر یاد آگئی جو ایک شام غروب آفتاب کے وقت کائنات کے ایک ریتلے میدان
 میں ایک پنجابی دوشیزانے اس کے لئے تیار کی تھی :-

گوماں

نام ہے گومتی، پنڈت جی پیاسے گوماں کہا کرتے ہیں کہتے ہیں مجھے اس سے
ایک طرح کا انس ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے پیار کرتے ہیں۔ اس کی محبت کا دم
بھرتے ہیں، اس کے چاہنے والوں میں سے ہیں، اپنا نام اس طرح جان نثار دل میں لکھواتے ہیں
کہ لوگ انہیں گومتی کا عاشق تصور کریں، مجھ سے کہی جاوے اس معاملے پر بحث کر چکے ہیں۔
”دیکھو بھتی میں مفت میں بدنام ہو رہا ہوں، لوگ طعنہ دیتے ہیں، اس بیچاری کو ہمسیکن اگر
سچ پوچھتے ہو، تم جانتے ہو میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا، دھرم سے کہتا ہوں اور تم
جانتے ہو مجھے دھرم سے بڑھ کر اور کوئی چیز پیاری نہیں۔ مجھے گومتی سے انس ہے، اس
انس میں گناہ کا نشانہ تک بھی نہیں، لوگ بوہنی بدنام کرتے ہیں۔“ ایک لمبی سانس لیکر...

”میرا کیا ہے اکیلی جان ہوں کچھ کٹ گئی ہے کچھ کٹ جائے گی، مجھے تو اس بیچاری کی فکر ہے اور اگر اس کے خاندان کو نپتہ لگ جائے تو پھر کیا ہو، تم جانتے ہو مرد کتنے نسکی مزاج ہوتے ہیں اور عورتوں کو اپنا ناموس کس قدر عزیز ہے، گو میری محبت پاکیزہ ہے، تم جانتے ہی ہو اس پر اس طرح کو آج نہیں بھڑکھی۔۔۔ خلیق کا منہ کون بند کر سکتا ہے، تم جانتے ہی ہو اچھا چھوڑو، اس معاملے کو لوگ یوں ہی نشوونے چھوڑ دیا کرتے ہیں، ہمارا دل صاف ہے لوگ جو چاہیں بلکیں۔ آؤ چائے پیئیں!“

اور پھر ہم چائے پینے میں مشغول ہو جاتے!

پینڈت جی بڑے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ نصیب اور آس پاس گاؤں کے تمام ڈھوڈو لنگران کے پاس بغیر مرض علاج آتے ہیں، ان کا پورا نام ہے۔ پینڈت بام دیوانی ہنوزی آف سلوٹری میں نے انہیں اکثر اسی طرح دستخط کرتے دیکھا ہے، لوگ انہیں صرف ”پینڈت جی“ کہہ کر پکارتے ہیں، یوں بھی دیکھتے ہیں اچھے خاصے بد صورت ہیں اور انہیں اپنی کم ہانگی کا اتنا ہی احساس ہے جتنا ایک حسین کو اپنے حسن کا

ایک ن آئینہ سامنے رکھے تو انھیں کون تیل لگا رہے تھے، یکایک بول اٹھے۔

”لال حسین، تمہیں تپہ ہے کنکریٹ کیا ہوتا ہے؟“

میں نے جواب دیا ”نہیں۔ تو“

”دیکھو ہم تمہیں بتانے دیتے ہیں۔ کنکریٹ وہ مسالہ ہے جس سے خالق باری نے بیسیوں صدی کے انسان بنائے، یہ بات سائنسدانوں نے ٹی بی کھوج کے بعد دریافت

کی ہے انہوں نے اس مسالہ کو تیار بھی کر لیا ہے مگر اس سے وہ انسان تیار نہیں کر سکے
اگر وہ ایسا کر سکیں تو ان میں اور پیشتر میں کیا فرق رہ جائے، سچ ہے نا؟
”بجا فرمایا آپ نے“

”تو دیکھو نا، ہم تم سب اس مسالے سے بنے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ خدا نے آپ
لوگوں کو پہلے بنایا اور مجھے سب آخر“
”وہ کیسے؟“

”بڑی سیدھی بات ہے، دیکھو نا، جب خدا سب لوگوں کو بنا چکا تو جو بچا کھچا مسالہ
پڑا تھا اسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس کا کیا کیا جائے، بہت غور و خوض کے بعد اس نے یہ
فیصلہ کیا کہ اس سے ایک ایسا مجسمہ تیار کیا جائے جو سب انبلا ہو، اپنی نظیر آپ ہو جس
رُعبِ حسن سے عورتیں غش کھا جائیں، بچے ماؤں کی گودلیں میں چھپ جائیں جس کے جمال
سے مردوں کے پریٹ میں بل پڑ جائیں، ہنستے ہنستے قلعہ ہر جائے، اُدھ لوری محسوس ہو
فراد دیکھو تو۔۔۔ ناک اندر دھنسی ہوئی، چھپک کے داغ، اہا سے ادھر یہ ہونٹ
پکے ہوئے انجیر کی طرح پھٹے ہوئے۔“ یہ کہہ کر آپ نے آئینہ زور سے میسر پر ٹھنچ دیا
اور لگے اپنے آپ کو گالیاں دینے۔

پھر کچھ دیر ٹھہر کر گنگنا نے لگے: ”عشق تیرے میں صنم میں نے صنم بل سے کس
کس کے، کس کس کے، کس کس کے، کس کس کے!“
”اومی کے راج میں، کتنا دخل ہے، یہ دیکھ کر میں بے اختیار ہنسنے لگا، پھر وہ

بھی میرے ساتھ بننے لگے، ہا ہا ہا۔

گو متنی حسین ہے مگر اُس کا حسن اُجھ سے کافارمولہ نہیں، ایک فنکار اس میں ہزاروں
نقائص دیکھ سکتا ہے۔ اس کے سینکڑوں عیوب بیان کر سکتا ہے، یہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے
حسن میں کچھ ایسی دلکشی و جاذبیت ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، مجھے اس کی
آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بڑی بڑی سیماہ آنکھیں، ناگوری گالے کی طرح مست اور پنڈت
جی کو اس کی ٹھوڑی اور وہ شیریں لہجہ آواز پسند ہے جسے سن کر ان کا دل کسی نامعلوم
مسرت سے کانپنے لگتا ہے۔ قصبہ کے حاکم اعلیٰ یعنی نائب تحصیلدار صاحب بھی اسے اکثر
تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ گو متنی ان تعریفی نگاہوں سے خوش ہو جاتی ہے۔ یہ
خیال کہ وہ حسین ہے اور لوگ اسے چاہتے ہیں۔ اسے ہر دم مسرور رکھتا ہے اور اپنے
خاوند پر حکومت جتا سکتی ہے، اُس سے ایک نئے زیور کی فرمائش کر سکتی ہے، روٹھ جاتی
ہے اور پھر چاہتی ہے کہ اُس کا خاوند اسے منائے۔ وہ بین بچوں کی ماں ہے۔

اُس کا خاوند ایک غریب دوکاندار ہے۔ قصبے کے چھوٹے سے بانا میں ایک سرسبز
پر چھوٹی سی دکان ہے۔ نمک، آٹا، تیل، کھدر اور گجرے وغیرہ بیچتا ہے۔ قد ٹھکانا، منحنی صورت، بڑا
زن مرید، گو متنی کو اُس سے کیسے محبت ہو سکتی ہے، یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہ آئی، اس
کے کپڑے عموماً میلے رہتے ہیں، بیچارہ ہر وقت دکان پر بیٹھا رہتا ہے، چلے قصبہ کی دکانیں
شام کے چوبیس بجے بند ہو جاتی ہیں، مگر وہ بیچارہ ہمیشہ کے لیے کھڑے ہو جاتا ہے۔

ہیں، گو متی کے غریب خاوند کو ہم نے دکان پر ہی بیٹھا پایا ہے اور اُس وقت شمع کی جھلملاتی ہوئی لو میں اُس کا چہرہ کتنا عجیب نظر آتا ہے وہ بودھوں کے دلائی لامہ کی طرح صمٹ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ کیا سوچتا ہے؟ شاید وہ سوچتا ہی نہیں، یا شاید وہ کسی گاہک کا انتظار کر رہا ہے ایسے گاہک کا جو کبھی آئیگا ہی نہیں۔ یا شاید الف لیلہ کا ایک بونا ہے کہ محفل ہزار داستان سے اُٹھ کر ہماری اس خاموش ہنشک رومان سے خالی دنیا میں چلا آیا ہے اور انتظار کر رہا ہے اُس زمانے کا جس کی حقیقت آج محض افسانوی ہے۔ منتظر ہے۔ اُس کائنات کا جس میں ہارون الرشید، ابوالحسن، الدین، امینہ اور بکبارہ بستے ہیں، کبھی اُس کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے یکایک ٹھٹھک کر رہ جاتا ہوں، اور جب وہ اپنے شانے کی طرح گردن نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ زمین پر کچھ پڑھ کر بچہ نک رہا ہے۔ جس کے سحر سے یہ زمین ابھی بھٹ جائے گی اور ایک جن نمودار ہوگا جو عدد کی سی آواز میں بولے گا: کیا چاہتے؟ — مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا، اس رومانیت سے خالی دنیا میں ایسا کبھی نہیں بلکہ ہر بار یہی ہوتا ہے کہ وہ غریب بنیادوں اٹھتا ہے۔

”کیا چاہتے؟ بابو جی؟“

اور میں جلدی سے گھبرا کر جواب دیتا ہوں: ”تین انڈے مرغی کے!“
 اور پھر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الف لیلہ کا بدنام نہیں، ایک غریب دکاندار ہے
 گو متی کا خاوند، گو متی جسے میں اور نائب تحصیلدار صاحب تعزینی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں

اور بس — اس دُنیا میں حُسن ہے مگر رُمان نہیں بخت ہے مگر محبِزِ ناپید، شاید یہی سوچ کر عمرِ خِیام کو دُنیا کے نامکمل مہرنے کا احساس ہوا ہوگا۔

پنڈت جی دن میں دو بار آٹھ آنہ تول انیم کی چسکی لگاتے ہیں، انیوں کی اتنی مقدار غالباً ہندوستان کے آٹھ دس ہیکار نو جوان گہ بجاٹیوں کو ابدی سکون عطا کر سکتی ہے۔ اور ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو گھٹانے میں ضبطِ تولید سے زیادہ مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ہند کے اصلاح پسندوں کو مصنوعی اور غیر قدرتی طریقے چھوڑ کر اس نعمتِ خدا داد کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کیا عجیب کہ اسی سے قوم کا بڑا بپا رہو جاتے، پنڈت جی سے پوچھئے، چسکی لگا کر کیسی رُوح پرور باتیں کرتے ہیں اور پھر لالہ سے چودہ چھٹانک دیسی شراب پی کر کس طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں! اس وقت دُنیا کے سیاست کی باگیں اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور کل کائنات کے اسرار و رموز ان کے لُطق میں گویا لائے۔
ایسی حالت میں جو دوا وہ تجویز کر دیں۔ بیمار حیوانوں پر اکسیر کی طرح اثر کرتی ہے۔ اس وقت کتنے ہی لوگ کہ جن کے ڈھور ڈونگروں نے اُن سے شفا حاصل کی ہے۔ ان کے جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں کہی پیر، سادھو کے استھان کی طرح شفا خانے میں لوگ آپ ہی آپ دودھ، مکھن، پنیر، پھل لئے آ رہے ہیں۔ پنڈت جی نیک آدمی ٹھہرے جو چیزیں عقیدت سے پیش کی جائے اُسے کس طرح مقبول کریں طرفہ یہ کہ اکیلی جان، کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں، چنانچہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دودھ، مکھن، پنیر اور پھل کا بیشتر حصہ گھماں کے

۶
وقت
کے لئے

گھر پہنچا دیا جاتا ہے، ویسے بھی انہیں گوشت کی لڑکیوں رانی اور مہلا سے بہت الفت ہے
یہ سب اشیاء بچوں کے لئے بھیجی جاتی ہیں اور غالباً اسی لئے قبول کی جاتی ہیں، رانی بڑی شخص
و طرار ہے۔ پنڈت جی سے ہر روز کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتی ہے مگر یہ فرمائشیں
اکثر شکر کی ڈال سے لیکر سیپ کی گڑیا تک ہی محدود رہتی ہیں صبح سیر کرتے ہوئے وہ راستے
میں گوشتی کے گھر سے رانی یا مہلا کو اٹھا کر سیر کے لئے لے جاتے ہیں اور شام کو ایک ہی کھاٹ پر
بٹیکھ کر گوماں سے گلچپ اڑاتے ہیں۔ ان دونوں کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر بوکیشہ کے شاہکار حسن
اور جبران کا تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ گوماں کی وہ نشیمنی نگاہیں پنڈت جی کے رخ
صحرائی پر ابر حرکت بن کر بستی ہیں، وہ اپنے آپ کو ان نگاہوں کی لائننا ہی وسعتوں میں کھودیتے
ہیں اور اکثر بالکل بیخود ہو کر شام کو جھومتے ہوئے واپس گھر آتے ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے، میں آتشدان کے قریب پاؤں پھیلاتے اور نگہ رہا تھا۔ مینہ
برس کر ختم چکا تھا اور بادل مغرب کے قریب شفق سے گل رنگ ہو گئے تھے۔ جلتی ہوئی
لکڑیاں چٹخ چٹخ کر مجھے لوری دے رہی تھیں اور قریب تھا کہ میں یہ دلفریب لوری سننا
سننا ان کی آغوش میں گر جاتا، اگر باہر کسی قدموں کی آہٹ نے نہ چونکا دیا ہوتا یا مڑ کر دیکھتا
ہوں کہ پنڈت جی شانے سے سیڑھے چہرے کو اپنے پرانے اور کوٹ کے اٹھے ہوئے کاندوں
میں چھپاتے کھڑے ہیں۔

”کیا بات ہے پنڈت جی؟“

جواب ندارد

”چپ کیوں ہو گئے بہ کیا اُداس ہو؟“

کامل سکوت

”کہیں بے بھاد کی تو نہیں پڑیں، دوست؟“

کوٹ کے اٹھے ہوئے کانروں سے ایک تہقنہ بلند ہوا، سکرٹے ہوئے شانے سیدھے ہو گئے اور حمیدہ گردن نے اپنے آپ کو اُدنچا کیا، میں چہرہ دیکھ کر جھنجھکارہ گیا۔ یہ گوماں خفی — سنس رہی خفی اور منہستی ہوئی دہری ہوئی جا رہی خفی۔

میں جلدی سے ٹانگیں جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور فرط حیرت اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ تو قف کے بعد میں نے گوماں سے پوچھا۔ ”آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟“

پنڈت جی کہاں ہیں؟

”نالے میں پڑے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔“

”ہائیں۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”کیا ہوا، کہیں۔“

وہ جلدی سے قطع کلام کر کے بولی لیکن اب اُسکی دلکش سنس غائب ہو چکی تھی۔

”ہونا کیا تھا، خاک؟“ اُس نے تیز تر لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ ”وہ آپکا دوست پنڈت

جی، پنڈت جی! — بد معاش کہیں کا۔۔۔۔۔ لپچا۔۔۔ مگر نہیں۔“ اک دم اس کا لہجہ

بدل گیا اور وہ ناسف انگیز لہجہ میں بولی۔ ”یہ سب میرا ہی تصور ہے؟“

کچھ دیر چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی، پھر اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

”بھائی! میں اسے کچھ اور ہی سمجھے تھے خفی، دنیا کچھ کہے میری نظروں میں وہ میرا بھائی تھا

میں نے اُس کے لئے خاوند کی گھر کیاں سہیں، نشہ داروں کے طعنے برداشت کئے
مگر اس سے غیروں کا راسلوک نہ کیا۔ آج اس کا صلہ یہ ملا کہ اُس نے پکڑ کر میرا منہ چوم لیا
..... میں..... میں..... یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اسی طرح روتے ہوئے اُس نے پنڈت جی
کا اور کوٹ اتار کر مجھے دیدیا اور اسی طرح سسکیاں بھرتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

• اور اُس کمبخت نے میرے بال فوج ڈالے۔ پنڈت جی آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے
اور میں اُن کے پیٹ پر مالش کر رہا تھا، میں تو بھلا شرابی تھا، نشے میں چور تھا۔ اب
وہ نشہ کدھر ہر ان ہو گیا تھا۔ مگر اُس نے میرا قطعاً کوئی خیال نہ کیا۔ اُس نے
مجھے گالیاں دیں، میرا اور کوٹ اتار لیا، اور مجھے کان سے پکڑ کر نالے پر لے آئی، باش
بھی ہو رہی تھی کمبخت آہ، بند بند دکھ رہا ہے اس نے میری رتی بھر پروا نہیں کی، آہ
وہ پھلوں کے ٹوکے، دودھ کے کلسے، مکھن کے گولے؟

میں اُن کی دلچسپ باتیں سن رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا، میرے کانوں میں
کے، سی ڈے کا وہ ریکارڈ گونج رہا تھا۔ دل لگانے کا نتیجہ مل گیا؟
ان کے کوچہ میں جو تو اے دل گیا
دل لگانے کا نتیجہ مل گیا

دل اکثر اس رہتا ہے پنڈت جی نے اپنی رونی صورت کو دو آتشہ کر لیا ہے

دوستوں سے بے رنجی نوکر دل سے خنکی اور مرضیوں سے بے اعتنائی اختیار کر لی ہے۔
 بات بات پر غصہ۔ بات بات پر ناراضی و جھجھکی کی سبب کوششیں ناکام رہی ہیں دوڑ
 کے ڈول اٹھا دیئے گئے ہیں پھلوں کے ٹوکے بغیر پانڈ لگائے واپس بھیج دیئے گئے ہیں،
 مگھن، ایک بال نکالے بغیر پھیر دیا گیا ہے کریں تو کیا کریں۔ قریب ایک گاؤں کا نمبر دار
 نور حسن اپنی خوبصورت گاہن گائے کو لے آیا کہنے لگا۔ پنڈت جی اسے دیکھئے، شاید
 سرودی لگ گئی ہے۔ بدن کا پتہ ہے، ہنسنوں سے ریشہ جاری ہے۔ کبھی کبھی کھانسی
 بھی ہے اور کھچلا دہنایاؤں بار بار اٹھاتی ہے پنڈت جی کوئی اچھی سی دوا دوا بھی
 ایک مہینہ ہوا اس کے ستواڑ سے لایا ہوا آپ کا بھلا ہوگا۔ پنڈت جی جلدے بھنے اٹھے
 جلدی سے ایک شیشی اٹھا لائے گائے کا منہ کھول کر اور میک چڑھا کر دوا انڈیل دی۔
 پلان تھا اگیو مکچر جلدی میں پلا گئے پنکچر آئیو ڈین گائے نے راستے میں ہی پران دینے
 نور حسن کو شبہ ہوا، گاہن گائے، خوبصورت گائے، نئی خریدی ہوئی، ناگوری نسل، تھانے
 میں ریشہ کھوا دی۔

عشقمی قسمت پنڈت جی کو تو خود ہی اس "گنو ہتیا" کا بہت افسوس تھا۔ اس پر
 "پولیس والوں" نے تنگ کرنا شروع کیا، اصل میں یہ تھا سبب "دوسروں کے جذبات
 اور احساسات سے قطعاً بے پروا ہوتے ہیں کبھی بھولے سے بھی اس کے دل میں یہ خیال نہیں
 گذرتا کہ وہ اپنے طرز عمل سے دوسروں کے نازک جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچا رہے ہیں
 پنڈت جی کو دیکھو لے مارے آپ ہی آپ شرم کے مارے مارے جارہے ہیں اب

بھلا پولیس کو دخل در معقولات کی کیا ضرورت تھی۔ لگائے تو فورجن کی مری یا ماری
 گئی، بھلا یہ تھا نیدار صاحب کیوں پرانے پچھتے میں مانگ اڑاتے ہیں اور ہاے ان کے
 تعلقات کتنے برسوں سے خوشگوار چلے آ رہے ہیں جبکہ یہ تھا نیدار صاحب ابھی سرنگلی میں سارا
 ہی ہوا کرتے تھے خود وہیں نے کئی دفعہ ان کی بھینس کی مرہم مٹی کی ہے کہ جب سکول کے
 فونڈوں نے اسے پتھر مارا کہ اوجھوا کر دیا تھا اور آج یہ ہم سے تین سو روپیہ رشوت میں
 بانگتے ہیں اور طرفہ یہ کہ دھکی دیتے ہیں جیل پہنچانے کی حوالالت کی کیوں یہ کہہ کر پنڈت جی
 میری طرف سے لگے ہیں نے لگا نہیں نیچ کی لیس اور بوٹ کی نوک سے زمین کر دینے لگا گیا
 تین سو روپے وہیں گڑے ہوئے تھے۔ اور بھلا کہتا بھی کیا نہیں سو روپیہ کہاں سے لانا پنڈت جی
 نے تو کبھی پھوٹی پانی بھی نہ رکھی تھی تنخواہ اور بالائی آمدن کے علاوہ ہمیشہ ادھار مانگ کر کھایا
 کرتے تھے زیادہ نہیں تو کہ ان کے ساتھ جسے تین چار سو تک انہیں قصبہ کے دکانداروں
 کا دینا تھا، اور ان سے ان کے کچھ مزید ملنے کی توقع نہ تھی۔ میں غریب آدمی ٹھہرا، ادھر
 ادھر سے مانگ مانگ کر پچاس روپیہ اکٹھے کئے، مگر یہ تو آٹھ میں نمک کے برابر بھی نہ تھا
 تھا نیدار صاحب حرص دار کے دانت تیز کئے ہوئے تھے، تین سو سے ایک پانی کم لینے کو تیار
 نہ تھے، بڑی مشکل کا سامنا تھا، اسی حیرت میں کسی دن گزر گئے آخر ایک دن تھا نیدار
 صاحب میرے پاس آئے کہنے لگے کیوں جتنی پھر کیا صلاح ہے چالان کر دوں، آخر
 کتناک چپ بیٹھا رہو نگا، فورجن بھی بگڑا ہوا ہے فرض کی بجا آوری تم جانتے ہی ہو
 ۱۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ فورجن نے آج تھا نیدار صاحب کی سٹھی کو کم کی تھی،

۲۔ گھر میں - پشیمانی - جت - تکرار
 ۳۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ فورجن نے آج تھا نیدار صاحب کی سٹھی کو کم کی تھی،

فرض کی بھآوری اتنے دن خاموش رہنے کے بعد آج پھر چمک اٹھی مٹھی۔

کوئی جواب نہ پا کر تختاندار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اچھا تو چلتا ہوں۔ اگر آج شام تک کچھ بن جائے تو بہتر، ورنہ کل تو معاملہ میرے اختیار سے باہر ہوگا۔

پنڈت جی کو ساتھ لئے رات کے بارہ بجے تک در بدر گھوما۔ کسی نے اس سے نہ بندھائی۔ رات ساری جاگئے کٹی۔ اور صبح میلے کچیلے بادلوں کا لبادہ اوڑھے نمودار ہوئی رات کو یہ خبر قصبہ میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ کہ پنڈت جی کو صبح گرفتار کیا جائے گا۔ صبح لوگ جوت در جوت آنے شروع ہوئے۔ ٹولیاں بنا کر، دو دو، چار چار کھڑے تھے کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ کہتی، کوئی پنڈت جی کی ”گٹو مٹیا“ پر نفرین کرتا تو کوئی تختاندار صاحب کی روپہلی مصحتوں کا تذکرہ کرنا بیٹنے مند اتنی باتیں گھر کے اندر پنڈت جی چپ چاپ بیٹھے حقہ گدگداتا رہتے تھے جب چاروں طرف سے ناامیدی نے گھیر لیا ہو۔ اندھیرے میں کہیں بھی شعل امید نہ دکھائی دیتی ہو، اس وقت طبیعت میں اپنے آپ سکون پیدا ہو جاتا ہے، قلب میں میری دور نہر شکل کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی تو یوں بھی بے پروا بے فکر تاج و عواقب سے بے نیاز، طبیعت کے مالک تھے جو کچھ ہو گا دیکھا جائیگا، صبر کر کے بیٹھ رہے تختاندار صاحب کی راہ دیکھ رہے تھے کہ آئیں تو کم از کم غلطیات نہ کر ہی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

یہ ایک کمی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور باہر لوگوں کی چیمگیوتیاں بھی یہ ایک بند ہو گئیں، نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ تختاندار صاحب نے غصے سے سر ہلاتے ہوئے

عقب کی جمع۔ مٹھی (جگام)

ہوئے دراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انکے بعد پولیس کے تین سپاہی اور انکے بعد
 بین پکس ہمارے قصبہ کے بھائی بند۔ تھانیدار صاحب نے ایک اڑتی ہوئی نگاہ سے میری
 طرف دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئے۔ میں نے انہیں اندر لیجا کر تھیلے میں بات چیت کی،
 گر کر لایا، پنڈت جی نے ان کے پاؤں بھی پکڑ لئے، مگر وہ خدا کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا پچاس
 روپے میں وہ معاملہ کیسے دبا سکتا تھا۔ اکیلا نور حسن ہی مشکل ڈیڑھ دو سو لکیر راضی ہوگا، مقدّر
 بالکل صاف تھا۔ گواہ موجود تھے۔ تھانیدار صاحب کو خود بہت رنج تھا۔ کیا وہ پنڈت جی
 کی گرفتاری کو پسند کرتے تھے؟ ہاں وہ اتنا کر سکتے تھے کہ پنڈت جی کو ہتھکڑی لگائے بغیر
 گرفتار کرتے۔

جب تھانیدار صاحب اپنا منشا ظاہر کر چکے تو پنڈت جی نے اٹھ کر اپنا اوور کوٹ
 اوڑھا اور نگاہیں نیچی کر کے بولے، ”چلئے، جدھر لے چلو، چلتا ہوں۔“
 میرا دل بھرا۔ پنڈت جی لاکھ بڑے سہی، پھر بھی میرے دوست تھے پس چلتا
 تو اس کمبخت تھانیدار کی بوٹی بوٹی فوج لیتا، مگر کیا کرتا، اپنے بس کی بات نہ تھی۔ نہ میرا
 گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پنڈت جی چلے آگے آگے تھانیدار صاحب تھے، اس کے بعد پنڈت جی
 سر جھکاتے ہوئے ان کے بعد پولیس کے سپاہی لوگ آگن میں کھڑے تماشا دیکھ رہے
 تھے، اہل قصبہ میں ایسا کون شخص تھا کہ جس کے مال مویشی کی خدمت پنڈت جی نے نہ
 کی تھی۔ اس آگن میں رلدورام شاہ بھی کھڑے تھے، اور گھینڈا مل بھی، چودھری پیر بخش
 بھی تھے اور ملک سرور خان بھی۔ کسی کو نہیں آتا، نہ خوف خدا، نہ اہل تماشا، نہ کھڑے

تھے۔ تھانیدار صاحب ابھی بمشکل آنگن میں چار قدم چلے ہوئے تھے کہ دروازے پر کسی نے روک لیا اور کسی کی مہین آواز سنائی دی اٹھ بیٹے،
 مجھے کسی کی سیال کچیل مارھی کا پتہ نظر آیا، آگے بڑھ کر دیکھا، گوشتی تھی، بمبئی جا رہی تھی، تھانیدار صاحب ایک طرف ہو گئے۔

گوشتی نے پنڈت جی کی طرف دیکھا، وہ سر جھکا کر صمکم بکم کھڑے تھے پھر اس نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا کر بولی، بھائی — میرے بھائی کو چھڑا دو۔ یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے ایک دیول سے بھری ہوئی تھیلی میری طرف بڑھا دی۔
 ”بھائی — میرے بھائی کو چھڑا دو۔“

گوشتی کے اس ایک جملے نے پنڈت جی کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، انہوں نے مجھے ہاتھ کے انتارے سے روپے لینے سے روک دیا اور آگے بڑھ کر گوشتی کے پاؤں چھو لئے اور شاک لہجہ میں بولے، بس بہن تمہارے روپے مجھے پہنچ گئے۔ میں قید سے آزاد ہو گیا۔“
 پھر تھانیدار صاحب کی طرف دیکھ کر پُر جوش آواز میں بولے، چلو، اب دیر کیوں لگا کر کھی ہے؟

پنڈت جی چھ مہینے سے جیل میں ہیں، وہاں فیم ملتی ہے نہ شراب۔ خوب مزے ہیں ہیں۔ کہتے ہیں گواں نے مجھے سدھار دیا۔

مصوّر کی محبت

دھرم سال

۲۰ ستمبر

میری مکلا

کتنی مختصر سی بات تھی جسے تم نے افسانہ بنا دیا، میری انگلیاں ہوں میں تم آج بھی
وہی ہو جو سوشیل کے آنے سے پہلے تھیں۔ میرے لئے پہلے کی طرح ہی دلکش و جاوید
کا کامل ترین مجسمہ ہو میں سمجھتا ہوں کہ میری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ پہلے کی
طرح ہی رُجوش اور بیجان انگیز ہے اور اس میں تمہاری ووری نے اور یاد دہانی کے ب
کا اضافہ کر دیا ہے۔ زندگی کے ان چند خوش آمد گاہت کہ جہاں نے تمہارے قرب

میں بسر کئے اپنا سرمایہ حیات سمجھتا ہوں، اُنہیں بھلا کیسے سکتا ہوں؟ تمہیں بھلا دینا — تم جو کہ اُن لمحات کا سرچشمہ و منبع ہو ایک ناممکن امر ہے۔

اور پھر — سوشیلا؟ — میں حیران ہوں۔ تم نے سوشیلا کا نام کیوں لیا؟ کیا یہ سچ ہے کہ عورت جو شرفِ رقابت میں عقل و حواس بھی کھو بیٹھتی ہے؟ اور پھر اس رقابت کا علاج کیا ہے؟ آخر تم نے میری محبت کو ”بھالو“ (ہرنیس کوہ) سے کیوں نہیں منسوب کیا۔ وہ بھی تو سوشیلا کی طرح موٹی ہے اور اتنی ہی کند ذہن اور تمہارے ہوشل میں وہ جو خوبصورت دھوبن آتی ہے کیا نام ہے اُس کا؟ — نورن؟ — ہاں — ہاں! وہی نورن — جسے دیکھ کر آدمی جیتائی کی پُرکینت تصویریں بھی بھول جاتا ہے۔ تم نے اُس کا نام کیوں نہ لیا تم جانتی ہو فنی نقطہ نگاہ سے میں اس کا گنا پرستار ہوں، اگر تم اس کا نام ہی لے بیٹھتیں تو مجھے رنج نہ ہوتا۔ بنگال کے سترناج شاعر چندنی داس کو ایک مضمون سے عشق تھا میں تو خیر ایک معمولی مصوّر ہوں جس کا شاہکار یہ ہے کہ اس نے اپنے دل کے قرطاس پر تمہاری تصویر کھینچ لی ہے، اجڈا کے رنگین نقوش کچھ مٹ چکے ہیں کچھ مٹ جائیں گے، مگر میری موت ہی شاید تمہاری صورت کو میرے دل سے مٹا سکے۔ شاید اس لئے کہ موت کے بعد کا مجھے علم نہیں!

اس اعترافِ محبت کے بعد تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں نے سوشیلا کو خط لکھ دیا تو کیا بُرا کیا، کیا کسی کے خط کا جواب دینا گناہ ہے، ممکن ہے کہ تمہاری اصطلاح میں ایسا ہو، مگر میں حسین نہیں اور نہ تمہاری طرح لشکرِ قزاق کے جذبات سے بے نیاز ہی —

اور اگر سوئیلانے اپنے خط کے ہمراہ اپنی تصویر بھی بھیج دی تو غالباً اُس کا یہ مدعا ہرگز نہ تھا کہ تمہارے سینہ میں حسد کی آگ مشتعل ہو جائے۔ غالباً وہ صرف اتنا چاہتی ہے کہ میں اُسے یاد رکھوں۔ شاید اسے مجھ سے محض افلاطونی محبت ہے۔ اور یہ کوئی اتنا برا جذبہ نہیں جتنا تم اسے سمجھتی ہو۔ شیلے کو غور سے پڑھو۔ اس کی شاعری محبت میں افلاطونیت کی بہترین مثال ہے۔ شیلے کی شاعری بھی اسی افلاطونی محبت کے طفیل زندہ ہے۔ شیلے کو غور سے پڑھو ورنہ ایم۔ اے میں فیمل ہو جاؤ گی، انتہائی محبت تو الگ رہا۔

اور کیا لکھوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خط پڑھنے کے بعد تم مجھ سے روٹھ جاؤ گی۔ مگر مجھے تم سے وہ لازوال بے پایاں محبت ہے کہ میں تمہارے روٹھ جانے کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں کر سکتا، عمر خیم کے بعد دنیا میں اگر کوئی دوسرا قنوطی پیدا ہوتا ہے تو وہ میں ہوں۔ بہتر ہو گا کہ مجھ سے روٹھنے کی صلاح نہ کرو۔ بہترین بات یہ ہو گی کہ رقابت کو دل میں جگہ نہ دو، میں تمہیں منافق بھی نہیں اور تم مفت میں اپنا دل جلاؤ گی۔ میں یہاں جھیل پچھلی کا شکار کر کے اور لمبی لمبی سیریں کر کے اپنے دن گزار رہا ہوں، میری صحت پہلے سے بہت اچھی ہے، مگر میں اس وقت تک تمہارے پاس موری آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ جب تک کامل طور پر صحت یاب نہ ہو جاؤں کہتے ہیں کہ خنجر دھڑکا

قلب کے لئے قرب محبوب موافق نہیں۔
 نوزن کی تصویر قریب قریب مکمل ہو چکی ہے، افسوس ہے کہ ڈاک میں یہ تصویر نہیں نہیں بھیج سکتا۔ حد نہ تمہاری نافرمانی کے سے بی نامورہ اشتیاق سے کہیں گئی کی

تصویر کو شروع کر دینگا۔ بگی کون ہے میں اس دلچسپ ہستی کے متعلق اگلے خط میں لکھوں گا۔ فی الحال یہی لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بگی ایک عورت ہے۔

تمہارا، شمیم سندھ

دھرم سال

۸ اکتوبر

میری بیوقوف کلا

کتبہ میں حسن کہ عقل سے خدا واسطے کا پیر ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں بیوقوف لکھا۔ یوں تو تم کہنے کو ایم اے میں پڑھتی ہو مگر اس امر سے تمہاری عقل کو کچھ سروکار نہیں یہ سب ہمارے طریقہ تعلیم و نصاب تعلیم کی نہم کاریاں ہیں۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ تم جیسی تہن و شیزائیں کالجوں میں لڑکوں کے وٹس بڈش پڑھتی اور مارشل اور مارکس کے معاشی نظریوں کی اس جاہلانہ انداز میں تنقید و تحقیق کرتیں جیسے وہ خدا یا ان نظریوں کو ان میں کیا پڑا ہے؟ آج تک کوئی عورت اقتصادیات و معاشیات کی ماہر نہیں بن سکی۔ یہ کہ رخت مسائل صنفِ رخت ہی کے لئے رہنے و دران معاشی و اقتصادی فلسفوں میں الجھ کر تمہاری الہیت، رنگینی، مصوئیت سب فنا ہو جائیں گی۔ اور اس وقت دنیا کو انہی چیزوں کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ سب نظریے تمہارے لئے بنائے گئے ہیں نہ کہ تم ان کے لئے۔ تم کو کم و کم میرے جناب دیان کے استر کے پچھتے ہیں

نصیب کرنا
ہر گھنٹہ

چیرنگی

مصور ہوں، حسن سرکش حُسن بے باک کو پسند کرتا ہوں مگر وہ حسن جو محتاج ہو عینک کا مجھے کسی حالت میں گوارا نہیں۔ شیلے کو پڑھو۔ شیلے اپنی شاعری کے بعض لمحات میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر نظر آتا ہے۔ آج بے وقوف گاڈون کو کون پوچھتا ہے اُس کا نام مخص شیلے کے نام سے زندہ ہے کیونکہ وہ شیلے کا استاد تھا۔ یا یوں کہو کہ شیلے اُسے اپنا استاد سمجھتا تھا۔ گاڈون کے پاس دو چیزیں تھیں۔ ایک اُس کا اشتراکِ مسئلہ دوسری اس کی لڑکی میری شیلے نے میری کو پسند کر لیا۔ اسی میں اُسکی عظمت پنہاں ہے، تنہا کے ساتھ دو چیزیں ہیں۔ ایک طرف ہیں رکارڈو کے نظریات اور دوسری طرف ہے محبت اور اللہانہ محبت جو قیود مذہب و ملت سے بیگانہ ہے۔ ان تمام فطریوں اور الجھنوں سے نا آشنا ہے وہ محبت جو ایک فرد کو دوسرے فرد واحد سے ہو سکتی ہے۔ اور جس میں اشتراکیت کا شائبہ تک بھی نہیں۔ اپنی عظمت کو پہچان لو۔

میں نے گئی کی تصویر بنانی شروع کر دی ہے۔ گئی ایک گوالن ہے۔ نہایت خوبصورت اور نہایت ہی بیوقوف۔ کل میں نے جھیل کے کنارے ٹھیک اسے تمہارا خط پڑھ کر سمجھایا اور میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ اُسے رکارڈو کے نظریہ کی مطلق پروا نہیں اور نہ وہ اسے تمہاری طرح عہدوں کا میسگنا کارٹا ہی تصور کرتی ہے۔ وہ مجھ سے شادی کی خواہاں ہے، وہ چاہتی ہے کہ اُس کے فوڈس بچے ہوں، بیوقوفوں کی طرح، جو مٹی میں پیدا ہوتے تو شاید اُس کے نصیب کھا۔ اتنے کا عجب کہ ٹھیک یا مسولینی اُس سے شادی کر لیتا۔ اور مجھے یہ ہتھی

ہوئے بہت افسوس ہوتا ہے کہ اُسے اتنا پتہ بھی نہیں کہ صاحبِ جن کے نظریہ محصولات میں کیا کیا خامیاں ہیں اور منہتر صاحب نے اُنہیں کس خوبی سے روکیا ہے۔ ہاں اُس کے بال بہت خوبصورت ہیں۔ سونے کے باریک تاروں کی طرح نرم و نازک اور آپس میں اس طرح الجھے ہوئے کہ گمان ہوتا ہے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ان گیسوؤں میں اکہ بند ہو گئی ہیں۔ شام کے وقت جب میں منشی کی ڈور ہاتھ میں لئے جھیل کے کنارے بیٹھتا ہوں اور جب شفق کی ارغوانی روشنی جھیل کے نیلے پانی سے کھلتی ہے۔ اس وقت وہ خوبصورت گوالن ایک ننھا سا بھیڑ کا بچہ گود میں لئے مدہم سروں میں گاتی ہے۔

مینوں دس کھاں فی مائے

کدوں گھر آوسی ماہیا ایسی کھلے نال لا ماہیا
مینوں دس کھاں فی مائے مینوں دس کھاں فی مائے

بگی کی آواز میں لوج ہے اور در و بجی اور پھر بے انتہا شیرینی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”بگی! تم نے کون سے میوزک اسکول میں تعلیم پائی ہے؟“ وہ کھلکھلا کر منہس پڑی۔ کہنے لگی۔ ”میوزک اسکول کیا ہوتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”جہاں یہ گیت سکھائے جاتے ہیں۔ گانا اور سروں کا اتار چڑھاؤ۔“ وہ بولی اور اب اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے خوابیدہ سی ہو گئیں۔ ”خیر نہیں تم کیسا کہہ رہے ہو؟ لو۔ اگے سنو۔“

اسمانیں اڑوسی ال ماہیا میرا تیرے اُتے دل ماہیا

ہُن آہن آہ۔ ماہیا گل نال لا نال لا۔ ماہیا

مینوں دس کھاں فی مائے

کتنا دلفریب نعمت تھا، اور کتنا پُراثر جاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ہر قطرہ اور پانی پر چھکی ہوئی ٹہنی کا ہر تپہ تر تم خیز ہے، یا ہر ذرۂ کائنات گوالن بن گیا تھا اور میٹھے میٹھے سروں میں گارہا تھا۔

مینوں دس کھاں فی مائے مینوں دس کھاں فی مائے

کہ شن جی کی منسی شاید انہی گوالنوں میں گونجی تھی۔ اور رادھا جی بھی شاید کوئی ایسی ہی گوالن ہونگی۔ اگر رادھا جی آج زندہ ہوتیں تو خدا جانے ٹیرف بورڈ کی موجودہ سفارشات کے متعلق ان کی کیا رائے ہوتی؟ دلچسپ سوال ہے اور تم جیسی ماہر اقتصادیات کے فکر رسا کے لئے نہایت موزوں، مجھے امید ہے کہ میری محبوبہ اپنے خط میں ضرور اس دلچسپ سوال پر روشنی ڈالے گی۔

منجھے بھائی اتر رسول لاہور روانہ ہو گئے ہیں۔ انہیں ایف۔ اے کے ضمنی امتحان میں بیٹھنا ہے۔ وہ مسوری میں ضرور تم سے ملیں گے۔ نورن کی تصویر ان کے حوالے کر دی گئی ہے۔ سنبھال کہ رکھنا۔ فیروز بھائی مہنوز لاہور کی پستیوں میں گم ہائی ٹینس ٹورنمنٹ کھیل رہے ہیں یا مسوری پہنچ گئے ہیں؟

تمہارا:- شیم سندر

دھر سال

۲۱ اکتوبر

کھلا!

معلوم ہوتا ہے کہ بخت کی نامساعدت ابھی میرا بچپا نہیں چھوڑے گی، نقل و حرکت کا دورہ کچھلے چند دنوں سے پھر تیز ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ چند دنوں میں صحت یاب ہو کر تمہارے پاس پہنچ جائیگا۔ مگر شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور ہے اچھا تو کالج کھل گئے ہیں۔ یہ تم نے نئی بات بتائی۔ ورنہ مجھ ایسے کنوار کو بھلا کب اس بات کا پتہ چلتا۔ میں نے مزید ایک مہینہ کے لئے چھٹی کی درخواست کالج میں بھیج دی ہے۔ فیروز بھائی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تمہاری اور ریشم کی ملاکی آپس میں گہری چھٹی ہے۔ کلاس روم میں بھی دونوں سہیلیاں ہمیشہ اکٹھی بیٹھتی ہیں اور ریفرشمنٹ روم میں بھی اکٹھے جانا ہوتا ہے۔ بازو میں بازو ڈالکر۔ میں نہ کہتا تھا کہ سوشیا بہت اچھی لڑکی ہے۔ گو اس کی ناک بہت چھوٹی ہے، مگر اس کا دل اتنا فراخ ہے کہ بیک وقت اس میں چار عاشق اور قریب قریب اتنی ہی سہیلیاں سما سکتی ہیں۔ میں اس بہنا پے پر بہت خوش ہوں اور اس بات کی امید میں ہوں کہ تم بھی میرے اور بگی کے رشتہ محبت کو خلوص کی نظروں سے دیکھ سکو۔ "نورن" تمہیں پسند آتی ہے مگر "نورن" کے پسند نہیں۔ سید صاحب نے بھی اپنے خط میں شاہاش کے لڈو بھیجے ہیں، لکھتے ہیں کہ۔ "امسال کالجیٹ

آرٹ سوسائٹی کی سالانہ نمائش پر تمہاری فورن کی تصویر کی بھی نمائش کریں گے۔
 ہزار ہزار شکریہ مگر میں یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ خود فورن کی اپنی تصویر
 کے متعلق کیا رائے ہے؟ تم نے اسے یہ تصویر تو دکھائی ہوگی؟

میں نے شروع شروع میں کئی کی تصویر کا ہلکا سا خاکہ تیار کرنا چاہا تھا مگر
 مجھے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میرے ہاتھ اسکی تصویر
 پر جتنے ہی نہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ جوں جوں کئی کو دیکھتا ہوں مجھے اُس کے متعلق نئی
 نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بظاہر نہایت نحیف لیکن باطن میں نہایت نمایاں دل کی
 گہرائیوں تک پہنچتی ہوئی، وہ ایک ایسا جواہرِ نرہ ہے کہ جس کے ہر کونے سے اور
 ہر پہلو سے ایک نئی شعاع کا انکاس ہوتا ہے۔ میں جب تک اس کے دل کی
 مختلف کیفیتوں اور رنگوں کو نہ پاؤں اس کی تصویر کو کیسے شروع کر سکتا ہوں ممکن
 ہے کہ تمہیں مونا لیزا کی تصویر اس موقع پر یاد آجائے، مگر میرے خیال میں اطالوی مصو
 نے مونا کے دل کی گہرائیوں کو پالیا تھا ورنہ ناممکن تھا کہ وہ ایسا بلند پایہ صورتی بنکا،
 آرٹ کی دنیا میں پیش کر سکتا، مصو اور معمول کے درمیان ایک نازک ترین رشتہ ہے
 اسے سمجھنے بغیر کوئی مصو حقیقی معنوں میں کامیاب نہیں کہلا سکتا، تم نے اپنی فطرت
 کو ہمیشہ مجھ سے چھپایا ہے۔ میرے نزدیک تمہاری دلکشی کا غالباً ہی بڑا سبب ہے اور
 شاید اسی وجہ سے میں تمہاری تصویر اس وقت تک نہیں بنا سکا تمہاری ہستی چھوٹی مونی
 کی طرح ہے جو ہاتھ لگانے سے بند ہو جاتی ہو۔ اس طرح کہ پھر کوئی تمہارے دل کے طوفانی جذبات کا
 اندازہ نہیں کر سکتا۔

سمٹی ہوئی، اور پتوں میں چھپی ہوئی نرم و نازک، مگر وہ کھل رہی ہے آہستہ آہستہ ہر روز
ایک دوسری پتیاں کھل جاتی ہیں، اور اپنی رنگینی سے دل کو مسرور بناتی ہیں، ایک دن
یہ کلی پھول کی طرح کھل جائے گی، شگفتہ اور منہتا ہو اچھول، پھر میں شاید اُس کی
تصویر بنا سکوں، ابھی نہیں۔

لاہور میں تو گرمی ہو گی، سکینجین مفرح اور لیمونڈ کا استعمال ہوتا ہو گا، مگر یہاں
اب سردی ہو گئی ہے، میں تو اُونی کپڑے پہنتا ہوں اور چائے پیتا ہوں،
اگلے مہینے غالباً برف باری بھی شروع ہو جائے گی۔ جھیل کا پانی ٹھنڈا ہو گا۔ اور
کناروں پر تیج بستہ بھی، شام کو مچھلیاں پکڑنے کی بجائے آگ تاپی جائے گی۔
اور جنوں بھوتوں کی کہانیاں صاحب دین چوکیدار سے سُنی جائیں گی۔
اگلی ڈاک میں مارس لیول کی ایک دو کتابیں بھیج دینا۔

شیام سندر

دھرم سال

۷ نومبر

فیروز بھانی

آج بگی کی موت کو سات روز ہو گئے، میں سوچتا ہوں، میرا کیا بنیگا۔ اور یہ
بے مصرف کائنات میرے کس کام آئے گی، میں جو ہر شے کے صوری پہلوؤں پر نظر ڈالنے کا
CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

خروج - فصل دوم

عادی ہوں۔ آج اس کرب انگیز حقیقت کا احساس کر رہا ہوں کہ دنیا میں سچی خوشی کی بنیاد ظاہری نہیں بلکہ محض نفسیاتی اور جذباتی ہے، ورنہ ناممکن تھا کہ مجھ جیسی فطرت پسند طبیعت پر لگی کی موت کا اتنا اثر ہوتا، اور وہی دلفریب تدرتی مناظر جو ایک ہفتہ پہلے میری بڑھاد روح کو بالیدگی بخشتے تھے اب یوں مجھ پر خندہ زن ہوتے، پرسوں سے پھر برف باری جاری ہے اور میں سامنے کے بند درتچے کے شیشوں میں سے ان برف کے گالوں کو دیکھ سکتا ہوں جو چپ چاپ کسی بیکس کے آئینوں کی طرح زمین پر گر رہے ہیں۔ کل دنیا اس سپید خموشی کے لہاوے میں لپٹی ہے، پرندے بھی خاموش ہیں، ہوا بھی ساکن ہے اور چاروں طرف موت کا سکوت چھایا ہوا ہے۔ مگر میرے دل میں اک قیامت خیز ہيجان بپا ہے۔

آج سے ٹھیک دس روز پیشتر بھی اسی طرح برف باری شروع ہوئی تھی لیکن آج اور اس دن میں کتنا فرق ہے!

میں اس روز جھیل میں ایک ہلکی سی ناز کو کھے رہا تھا، آسمان بالکل صاف تھا۔ جھیل کے پانی کی طرح نیلا، اور مغربی شفق سے رنگین، میں ناز چلا رہا تھا اور ایک مبہم خوشی کے زیر اثر ایک بے معنی پہاڑی گیت گا رہا تھا۔ جھیل کے اُس پار لگی ریوڑ پھر اُسی تھی اور مجھے اُس کلمہ کا ندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی اوتار رہا تے عنکبوت کی طرح چمکتے ہوئے بال صاف نظر آ رہے تھے۔

اتنے میں نہ بکا جھک چلنے لگا، آسمان پر کالے کالے بادل اُٹھے ہوا میں تیزی آؤ خنکی آگئی اور جھیل کا پانی ابھریں مارنے لگا، میں نے بھی زور زور سے کھینا شروع کر دیا اور

ناؤ کو جلدی سے پار لگانے کی کوشش کی، بمشکل کنارے پر پہنچا تو بوندا باندی اور پھر ساتھ ہی تڑاڑاؤے بھی برسنے شروع ہو گئے۔ بہزار غرابی کشتی کو کنارے پر گھسیٹ کر ایک جھاڑی سے بانڈھا اور دُور پرے ایک درخت کو دیکھ کر اُس کی طرف بھاگا۔

اولے پڑتے گئے اور میں بھاگتا گیا۔ اپنے سر کو بچانے کے لئے میں نے اپنا کوٹ اتار کر دونوں بازوؤں سے سر کے اوپر چھاتے کی طرح پھیلادیا اور بھاگتا گیا، بجلی کی چمک بادل کی گرج، اور ہوا کے بنانی فرائے ہوش و حواس گم کئے دیتے تھے، آخر وہ درخت قریب آگیا اور میں ایک جیت لگا کر اُس کے تنے سے پیچھ لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور دل پر ہاتھ رکھا۔ بچاؤ کتنے زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی پھوٹ جائیگا ایک طیل عرصہ کے بعد جب سانس کی وہ دھونکنی ڈھیلی پڑی دل ٹھکانے آیا اور حواس بجا ہوئے۔ تب جا کر کہیں میری آنکھیں کھلیں اور میں نے ادھر ادھر دیکھا شروع کیا۔

بجائے اکتا بڑا سرول کا درخت تھا۔ صرف تنے کا پیٹ ہی ساٹھ ستر فٹ ہو گا اور کتنا اونچا درخت تھا۔ دور اوپر کہیں سے اولوں کی "تڑاڑ" کی آواز آرہی تھی مگر اس گھنے چھتتاے کے نیچے کوئی آواز نہیں کرتا تھا۔ چاروں طرف قیامت کا منظر تھا، لیکن یہ تین سو چار سو بائیس سو سال کا پرانا درخت، ایک پرشور حبیب بحری طوفان میں ساکن جزیرے کی طرح قائم تھا۔ ایک بے آب و گیاہ ریگستان میں خوشنما لہلہاتے ہوئے نخلستان کی طرح تنہا، قدرت نے ایک ہی جھلک میں کائنات کی تصویر کے دونوں پہلو دکھا دیئے۔

میں یونہی سوچتا ہوا اپنے بھیگے ہوئے کوٹ کو نچوڑ رہا تھا کہ اتنے میں کہیں پاس
 ہی سے بکری کے بچے کئی میں ہیں "سنائی دی۔ مٹا گھوم کر اور درخت کے تنے کے دوسری
 طرف جا کر دیکھتا ہوں کہ تنے میں ایک بڑی سی کھوکھ ہے جس میں بگی خاموش
 "صم صم بکم" ایک سونٹے کے سہارے کھڑی ہے اور بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ اس کے
 پاس ہی قدموں میں بیٹھا ہوا ہے۔

مجھے دیکھ کر بگی ایک دم کانپ اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار
 ہوئی اور پھر آہستہ سے اُس نے اپنا سر نیچا کر لیا۔

میں نے ایک بکری کے بچے کو آہستہ سے گود میں اٹھا لیا سردی میں مجھے اسکی
 نرم نرم پشیم کے گھنے بال نہایت بھلے معلوم ہوئے۔ یونہی اس بکری کے معصوم بچے کے
 سر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے میں نے بگی سے پوچھا۔

"دو دن سے میں نے تمہیں نہیں دیکھا بگی؟"

وہ خاموش رہی، آنکھیں جھپکائے ہوئے۔

میں بکری کے بچے سے کھیلتا رہا۔

اب چاروں طرف خاموشی چھا گئی تھی، او لے برسے بند ہو گئے تھے۔

آخر ایک صدیوں کی طرح لمبے عرصے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا: یہاں تو

بہت سردی ہے کیا میں کھوکھ کے اندر آ سکتا ہوں؟

کوئی جواب نہ پا کر میں کھوکھ کے اندر آ گیا۔

”ہونہرہ۔ اچھی خاصی کوکھ ہے۔“ میں نے آپ ہی بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔ پتہ نہیں اس درخت کی عمر کیا ہوگی؟ گئی ہے۔ شاید دو تین سو سال ہوگی۔ کیوں گئی؟ ٹھیک ہے نا؟ کتنی اچھی جگہ ہے۔ طوفان اور برف و باران میں غریب چرواہے اسی درخت کی کوکھ کا سہارا ڈھونڈتے ہوں گے، ٹھیک ہے نا؟ بونٹیں کیوں نہیں؟“

گئی کھلکھلا کر سنس پڑی، آہ، وہ دلکش سنسی، اس کے موتیوں کی طرح خوشنما دانت چمک رہے تھے اور اُس کا غنچہ سادہ من، اس کو ہستانی گلاب کے پھول کی طرح روشن ہو گیا جس کے درمیان برف رکھ دی گئی ہو۔

میں نے بکروٹے کو زمین پر چھوڑتے ہوئے پوچھا: ”کیوں سنس رہی ہو گئی؟“ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سنس رہی تھی اور کانپ رہی تھی، اُس کے بازو ننگے تھے اور اُس کی قمیص جا بجا بھٹی ہوئی تھی۔

”تمہیں سردی لگ جائے گی۔“ لویہ کوٹ پہن لو۔“

اُس نے سنسنا بند کر دیا اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ میں اُسے کوٹ پہنانے لگا۔ جب میں کوٹ پہنا چکا تو اُس نے آہستہ سے اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیئے اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور سسکیاں لیکر رونے لگی۔

میں اس کی سنسی کو نہ سمجھ سکا تھا۔ لیکن اُس کے رونے کو سمجھ گیا، محبت کے پرسوز نغمے نے یکایک دل کے دیرانے کو روشن کر دیا۔ میں گئی کے پریشان بالوں سے کھیلنے لگا۔ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور اپنی پریشان لٹوں سے آنسوؤں کو پونھتی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ

اس کی سسکیاں کم ہوتی گئیں۔

اولے بند ہو چکے تھے اور اب برفباری شروع ہو گئی۔ چاروں طرف دھند اور تاریکی چھا رہی تھی، شاید اس اتنی بڑی دنیا میں اب وہی سرول کا گھنا چھتنا راعفو ظاہر ہو گیا تھا اور اسی چھتنا کے نیچے کھڑے۔ دودھ اور دودھ کتے ہوئے دل بابر کے طوفان سے پناہ مانگ رہے تھے۔

اور — اگر اسی کو کھ میں کھڑے کھڑے محبت کے ان دو پتنگوں کی عمریں بیت جاتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا!

سرول کا چھتنا را، بھیڑا بکریوں کا رپڑا، گئی اور میں، اور خوشی کے آنسو، یا شاید غم کے آنسو! کون کہہ سکتا ہے؟ فطرت کس قدر پراسرار ہے!

اور اُس کے دودھ بعد وہ مر گئی، نہیں، اُس کے وحشی باپ نے اسے مار ڈالا۔

کیا وہ ایک رات بھر ایک سرول کے درخت کی کوکھ میں ایک اجنبی کے پاس نہ رہی تھی؟ اُس نے ٹھیک کیا اُسے مار ڈالا۔ یہ جھگ کا قانون تھا، اُس نے اس کی لاش کو گھسیٹ کر جھیل کے کنارے برف پر پھینک دیا، شاید میری اپنی آنکھوں نے اسے جھیل کے کنارے برف کے سفید بستری پر سوئے ہوئے دیکھا، کتنی گہری نیند تھی، کبھی نہ ختم ہونے والی، اُس کے بازو کھلے تھے، اُس کے سنہری بال اُلجھے ہوئے، چہرہ کنول کے نورانی پھول کی طرح سپید، اور اس کی کنول کی ڈنڈی کی طرح نازک گردن میں ایک گہرا

شکات تھا۔ یا قوت کی طرح گہرا سُرخ۔ میں جانتا ہوں کہ میں اُسے اس طرح پڑے دیکھ کر
 پاگل ہو گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے اس وقت آگے بڑھ کر اور گھٹنے ٹیک کر اُس گہرے
 یا قوتی گھاؤ کو چوم لیا تھا۔ آہ، مگر یہ تو ایک بیوقوف مصوّر کی فطری کمزوری تھی۔ وہ اس
 ایک دوسے سے اُس سونے کی صورت میں روح پھونکنا چاہتا تھا۔

بے سود، محض بے سود۔

تم کہتے ہو کہ میرا خط پڑھ کر کھلا پہرہوں روتی رہی، تمہیں پتہ ہے فیروز، میں ان سات
 دنوں میں کس قدر رو یا ہوں، کیا میرے آنسو کھلا کے آنسوؤں کی سزا ہیں، جانے دو فیروز بھائی
 یہ آنسو کس کام کے ہیں، میرے اور کھلا کے۔ بے سود، بالکل بے سود۔

پتہ نہیں یہ آنسو کب بند ہوں گے، پتہ نہیں یہ برباری کب بند ہوگی۔ بہر صورت
 میں کل ضرور جھیل کے اُس پار جاؤں گا۔ جہاں سرول کا ایک گھٹنا چھتتا رہا ہے، جس کے
 تنے میں ایک بڑی کوکھ ہے، جھیل کے کنارے میری کشتی انتظار کر رہی ہوگی اور جھیل کے
 اس پار میری گئی!

یہ کون گاربا ہے۔ سنتے ہو۔ کتنا بیٹھا، پُر درد گیت ہے۔

ہن آ، ہن آ، ماہیا گلے نال لا، نال لا، ماہیا

مینوں

روزنامہ پھولیس۔ تھانہ دھرم سال

۸ نومبر

آج ڈاک بنگلہ کے چوکیدار مسمی صاحب دین کی رپورٹ پر کالا رام خواندہ
کنسٹبل کو جھیل پر بھیجا گیا، ایک ٹوٹی ہوئی کشتی ملی اور پانی میں تیرتی ہوئی
ایک لاش، چوکیدار مذکور کا بیان ہے کہ اُس نے کل شام متونی کو آخری
مرتبہ دیکھا جبکہ وہ ننگے سر جھیل کی طرف بھاگتا ہوا آج رہا تھا، چوکیدار نے
کئی بار آوازیں دیں۔ مگر متونی نے کوئی جواب نہ دیا۔ متونی رات کو
واپس بنگلہ پر نہیں آیا۔

متونی کے جسم پر کوئی پوٹ یا خراش نہیں، موت غالباً خودکشی سے
ہوئی یا اتفاقیہ ڈوب جانے سے، متونی کا نام شیام سندر تھا۔ وہ
لاہور کا رہنے والا تھا اور یہاں بغرض سیر و سیاحت آیا تھا۔ لاش بغرض
پوسٹ مارٹم سول سرجن صاحب بہادر کو بھیج دی گئی ہے۔ مزید تفتیش جاری
ہے۔

بقلم خود

حق نواز خاں صدر محرر

تھانہ چوکی دھرم سال

زالمیہ ہندوستان میں

جوانی

اگرچہ کہ یہ ساری باتیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

میں نے پہلے ہی کہیں کہیں کہیں کہیں

یرقان

”یرقان بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں۔“ یہ بھی ڈاکٹروں کا ایک مفروضہ ہے۔ سائنسدانوں کے اس مفروضہ کی طرح کہ چاند بذاتِ خود روشن نہیں، دراصل اسی قسم کے مفروضوں سے فرض ڈاکٹر اور سائنسدان عامیوں سے الگ پہچانے جاسکتے ہیں، ورنہ یہ تو غیر ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی چاند کی ٹھنڈی چاندنی اور یرقان جیسی تکلیف دہ بیماری سے انکار کر سکے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری بات پر مطلق یقین نہ کیا جائے اور اسے محض ایک یرقانی نظریہ قرار دے کر طاقِ نیل پر دھردیا جائے۔

بہر حال آپ کو باور کر لینا چاہئے کہ یرقان ایک بیماری ہے اور بہت اذیت پسند بصورتِ دیگر آپ کو اس کہانی کے پڑھنے یا سننے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کہانی کے شروع ہونے پر میں یرقان میں مبتلا تھا، جس طرح سادان کے اندھے کو ہر طرف سبز ہی سبز دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح یرقان میں آدمی کو ہر طرف زردی ہی زردی نظر آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی غیبی ہاتھ نے کل کائنات پر زعفران انڈیل دیا ہو اور بس۔ اس کے بعد مرض کا ایک اور درجہ ہے، زندگی کی ایک منزل ہے، جہاں سب دوئی مٹ جاتی ہے اور مجھ ایسا شریف کنوارا نروان حاصل کر لیتا ہے۔

بس یہی بیماری اس مختصر سے قصہ کی ابتدا تھی، اند میں بیمار پڑتا نہ شامامیری عیادت کو آتی۔ شامامہ کے متعلق میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میری محبوبہ ہے یعنی میں اُس سے محبت کرتا ہوں اور وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے جو چکوال میں اینٹوں کے ایک بھٹے پر ملازم ہے، بیس روپے تنخواہ پاتا ہے اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدور مل کی حاضری لگاتا ہے اور کبھی کبھی اپنی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے جس میں اکثر سیف الملک شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں، شامادہ خط اکثر مجھ سے پڑھوایا کرتی ہے، اُس وقت اُس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے بچاری اُن پڑھنے لگا اور جب میں سیف الملک ملک الکلام کی تشریح اپنے مخصوص یرقانی انداز میں کرتا ہوں تو کسی قدر گھبرا جاتی ہے۔ لجاتی ہے اور پیار می معلوم ہوتی ہے۔ گل غرض پر چپک اور آنکھوں میں دمک آ جاتی ہے لب کانپتے ہیں اور پھر مجھے یکایک اس کی مہین شیریں آواز سنائی دیتی ہے: "اگے کیوں نہیں پڑھتے؟" اور میں بھلا نظر پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے لگ گیا تھا، محبت، نہ میں یرقانیت آیا اللہ مجھے محبت ہے کہ یرقان،

ایک دن وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے میں بستر پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا، ہمارے پڑوسی نے ریشم کے کیڑے پالے تھے، وہ ان کے کوئے بیچتا تھا، بڑی اچھی تجارت ہے، پچھلے سال اُس نے دو ماہ کے قبل عرصے میں کوئے بیچ کر تین سو روپے کمائے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی اس سے آٹھ دس ریشم کے کوئے مانگ لایا تھا۔ اُن کو یوں میں سے پانچ بھوٹ گئے تھے اور اُن میں سے ریشم کے کیڑے نکل آئے تھے، سفید اور زردی مائل کیڑے جو کو یوں سے نکل کر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، صرف سات دن زندہ رہتے ہیں، اُس عرصے میں زرد مادہ آپس میں جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد زمر جاتا ہے۔ پھر مادہ انڈے دیتی ہے، زرد باریک اور گول گول، خشخاش کے دانوں جیسے، اس کے بعد مادہ بھی مر جاتی ہے۔ بس یہی سات دن اُن کی حیاتِ معاشقہ ہیں۔

میں ان ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا، ان میں چار نہ تھے اور ایک مادہ، بڑے بڑے زرد پروں والی، جو خاموش بیٹھی نہ کیڑوں کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے نہک رہی تھی، وہ کیسے پسند کرے گی۔ کس پر اس کی نظر انتخاب پڑے گی، وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس سمیں تن حسینہ کا محبوب ہوگا۔ آپ سچ جانئے مقابلہ واقعی سخت تھا، نہ کیڑے دیوانہ وار بھونروں کی طرح اُس کی طرف اڑا کر چلے جلتے تھے، وہ پروانوں کی طرح شمع کے گرد طواف کرتے تھے، کبھی وہ آپس میں گتھ جاتے، اس طرح کہ مجھے ان میں سے کسی ایک کی ہلاکت کا شبہ ہو جاتا، پھر میں جلدی سے انہیں الگ

اگ کر دیتا، وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہتے، بالکل خاموش، سچس و حرکت مگر جلد ہی وہ حسین مجسمہ انہیں اپنی طرف مائل کر لیتا اور وہ پھر بے اختیار پھڑپھڑانے لگتا، کبھی ایک کبھی دوسرا اڑ کر مادہ کے پاس جاتا اور اپنے منہ کو اس کے منہ کے قریب لا کر نہایت چرب زبانی سے اپنے عشق کا اظہار کرتا، وہ کافر ادا کبھی مسکراتی، کبھی بے اعتنائی سے منہ موڑ کر پرے ہو جاتی، نہ بچا را اپنا سامنے لے کر رہ جاتا عورت کی فطرت میں دور خمی کیوں ہے، ایک ہی نظر سے یہ گھاؤ بھی پیدا کرتی ہے، اور اس پر بچا ہا بھی رکھ دیتی ہے۔ دل تڑپا دیتی ہے اور تسکین بھی پہنچاتی ہے۔ ستم بھی اس کو بھٹتا ہے کہ ہم بھی اس کے شایاں ہے

یہی سوچتے سوچتے میں نے آنکھیں بند کر لیں، کسی کے پاؤں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی اور کوئی میرے سر ہانے آ کر کھڑا ہوا۔

میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی کہا: "ماں دلہ لائی ہو؟"

"نہیں، میں ہوں شاما"

اگر میرے پیٹ پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل بکھٹ بکھٹ جاتی تو بھی مجھے اس قدر تعجب نہ ہوتا جس قدر شاما کے آنے پر ہوا، جب سے میں بیمار ہوا تھا اور مجھے بیمار پڑے تین ماہ ہو چکے تھے، وہ ایک دفعہ بھول کر بھی مجھے پوچھنے نہ آئی تھی، کیا اُس کے خاوند کا چکوال سے کوئی خط نہ آیا تھا؟

"شاما، تم پتہ میں نے خالص ڈرامائی انداز میں کہا۔"

”ہاں میں! اُس نے خالص دیہاتی انداز میں جواب دیا، یہ لوگ تمہارے لئے چند ایک خوبانیاں لائے ہوں، خوب پتی ہیں اور میٹھی“ یہ کہہ کر اس نے رومال کھول کر سب خوبانیاں میرے بستر پر بکھیر دیں۔

یہاں میں مجھے دو چیزیں بہت مرغوب و موافق تھیں، ایک خوبانی دوسری شاما، اور پھر حجب دونوں اکٹھی مل جاتیں تو میری خوش قسمتی کے کیا کہنے، آج میں واقعی خوش قسمت تھا، میں آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا، ادراخبار کا وہ صفحہ جس پر ریشم کے کیڑے دھرے تھے۔ آہستہ سے پرے رکھ کر کہا: ”آؤ بیٹھو“

وہ پالنتی پر بیٹھ کر بولی: ”کیا حال ہے؟“

”اچھا ہے“

کچھ دیر ہم دونوں صم صم بکھڑے رہے، میں نہ جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہئے، دل میں جذبات کا طوفان اُٹھ آیا تھا، اپنے غم اور غصے کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا مگر بیکار زبان لگ ہو گئی، دل میں شکایتوں کا طوفان تھا، مگر لب جیسے کسی نے سی دیئے تھے، دل میں بھینی کا طوفان تھا، مگر آنکھیں اس کے چہرے کو دیکھ کر مسرور ہو گئیں۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے کہا: ”چکوال سے کوئی خط آیا؟“

”نہیں تو، تم تو بہت ہی نحیف ہو گئے ہو، تمہاری آنکھیں اس قدر زرد کیوں ہیں، مجھے از حد افسوس ہے میں اس سے پہلے تمہارے ہاں نہ آسکی، ماں کی طبیعت علیل تھی، خوبانی کیوں نہیں کھاتے، کھاؤ!“

میں نے مشکورنگا ہوں سے اسے دیکھا، ایک خوبانی اٹھائی اور منہ میں ڈال کر دل کو صحت و ملامت کرنے لگا، اے میاں کچھ تو کہو، اگر شکایت کی جرأت نہیں تو اظہار محبت ہی سہی، ان تعریفی نگاہوں سے کیا ہوتا ہے، نکل کر بات کرنا سیکھو، گونگے عاشق کو تو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی پسند نہیں کرتیں۔

”شاما، تم . . .“ میں نے کہنا شروع کیا۔

”اچھا، یہ ریشم کے کیڑے ہیں! شاما نے جلدی سے اخبار کو اپنی طرف سرکا کر کہا۔ کس قدر خوبصورت ہیں، تم نے کہاں سے پائے؟ اچھا یہ مادہ ہے، یہ نہ نہیں، کیا خوب، اور اب اس نرمادہ کا آپس میں ایجاب قبول ہو گیا، ^{منظور کرنا۔} ^{افزار۔} ^{قبول} دیکھو تو یہ کیڑا بڑا انسان ہے، پتہ نہیں اس سے کیا کیا میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے، سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں۔

ہے نا، یہ جوڑا نا لگ ہوا۔

”اب یہ باقی تین کہاں جائیں گے بچارے کس طرح سسک رہے ہیں دیکھو۔“

میں نے شاما کی طرف دیکھا، سونے کی مورت معلوم ہوتی تھی۔ لب تھوڑے سے کھلے تھے اور طلائے اجمر کی طرح دمک رہے تھے۔ سرخ

”تم کس قدر خوبصورت ہو شاما“ میں نے سینمائی انداز میں کہا۔ اس سے بھی زیادہ خوبصورت جتنا کہ تم اپنے آپ کو سمجھتی ہو، میری آنکھوں اور نہ ہائے حسن کے درمیان ایک زرد پردہ حائل ہے، مگر پھر بھی تم مجھے بہت حسین نظر آتی ہو، اور اگر یہ پردہ سامنے سے

بہٹ جائے تو پھر کیا تیرا بٹاک حسن میری آنکھوں کو خیر نہ کر دے گی۔ . . . اور تنہاری
آنکھیں کس قدر روشن ہیں، صاف اور پاکیزہ، نیلو فر کی طرح کھلی ہوئیں۔
ماں دلیہ لیکر اندر آئیں کہنے لگیں۔ بیٹا نیلو فر کی بابت کیا کہہ رہے ہو۔
”کچھ نہیں اماں یہی . . . یہی . . . کہ . . . سنا ہے کہ نیلو فر بتان میں
بہت مفید ہے۔“

”ہاں میں ابھی ابھی ان سے یہ ذکر کر رہی تھی۔“ شامل نے سر جھکا کر کہا۔ پتہ نہیں
انہیں موافق آئے نہ آئے۔“

”نہیں بیٹی، مجھے دیسی دوائیوں پر یقین نہیں اور بعض حکیم تو . . . آماں
شاما سے باتیں کرنے لگیں، میں چپ چاپ دلیہ لھانے لگا۔“

شاما بہت حسین تھی۔ اس لئے چاہئے اے بھی بہت تھے، وہ بیاہی ہوئی تھی
اور یہاں میکے آئی ہوئی تھی۔ عاشقوں کے دافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔ اس کا باپ
مرچکا تھا اور اس کی والدہ اس رنڈا پے میں بھی سہاگ کی شان اور جوانی کی آب
کو قائم رکھے ہوئے تھی، اس امر نے بھی شاما کے عاشقوں کی تعداد میں معتدبہ
اضافہ کر دیا تھا۔ اور ان تمام امور کا شاما کو بخوبی احساس تھا، اس کے شریف اور
بدعشہ ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔

ہمارا قصہ بہت چھوٹا ہے، انکا کہ اس میں صرف پانچ حکیم تین ڈاکٹر اور دو وید

پرکٹس کرتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی صرف ایک دوکان ہے۔ ملائی کی برٹ بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں، اور وہ ایک نوجوان ہے۔ مینچلا اور شاہا کا چاہنے والا شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برٹ مفت کھا جاتی ہے، صرف دو درزی ہیں، ایک بچارہ ہے سیدھا سا دھآ آدمی، وہ قمیض کی سلائی دو آنے تک خوشی سے قبول کر لیتا ہے، دوسرا راولپنڈی پاس ہے۔ اس نے تین سال تک راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف انگریزی "ٹیلرنگ شاپ" میں کام سیکھا ہے۔ وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے جتنی کپڑے کی قیمت ہو، ہمارے قصبے کے نوجوان اس سے بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں۔

ہمارے قصبے میں ایک مڈل سکول ہے، پہلے پرائمری تک ہی تعلیم دی جاتی تھی مڈل کلاسیں اس سال کھلی ہیں، ہیڈ ماسٹر صاحب نو وارد ہیں۔ خوبصورت خوش طبع جوان ہیں، سکول کو اپنے کالج کا بدل بنانا چاہتے ہیں۔ گائے خوب ہیں، دوسرے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کوئی گراموفون رنج رہا ہے۔ پیادہ قوال کا۔ من تو شدم تو من شد ہی "انہیں بہت مرغوب ہے، شاما کے گھر سے گزرتے ہوئے انہیں اکثر گنگناتے بلکہ صاف گاتے ہوئے سنا گیا ہے۔ شاما بھی کبھی درپچے میں بیٹھ کر سن لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت ایک عجیب مسکراہٹ ہوتی ہے۔ جوش رقابت میں، میں اُسے محبت سے تعبیر کرتا ہوں۔

ہمارا قصبہ نائب تحصیلدار صاحب کا صدر مقام ہے، وہ مجسٹریٹ بھی ہیں، اور

طیب بھی، اُن کی غیر معمولی ہرولعزیزی کا بڑا بھاری سبب یہی ہے۔ فارسی اچھی خاصی جانتے ہیں اور ادیب بھی ہیں، شاما کو خالص فنی نکتہ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں اور اس پر اس انداز سے تنقید کرتے ہیں، گو یا شاما، شاما نہیں، زندہ عورت نہیں بلکہ لڑکیوں کا ایک مرزبان محمد ہے یا باطلی سبلی کی پُرکیت تصویر۔

ہمارے قصبہ میں باوا تھن گر کا استخوان بہت مشہور ہے، عقیدت مند رو میں جو اکثر طبقہ انات سے تعلق رکھتی ہے انہیں صرف باواجی کہہ کر پکارتی ہیں، باواجی کی جوانی دھل چکی ہے، مگر ہر بات میں جوانوں سے آگے قدم دھرتے ہیں، فنا ہونے سے پہلے کھیلتی ہے، موج پانی پر، چرس کا دم لگاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور شاما سے افلاطونی محبت رکھتے ہیں، قد لانا، جسم اکہرا، اور رنگ بگلے کی طرح پسید ہے۔

سادون! سادون برسات کا مہینہ ہے، سادون میں جھولے پڑتے ہیں شاعر اور ندی نالے طغیانی پر جاتے ہیں، دل میں منگیس اٹھتی ہیں شاید خون کچا ہوتا ہے، جوش مارتا ہے، میں نے بھی اپنی کوٹھڑی چھوڑ دی اور باہر باغ میں آ رہا، سر دل کے ایک گھنے چھتتا رے کے نیچے میرا بستر تھا اور اس کے نزدیک ہی ایک چنار پر ہمیری چھوٹی بہن نے جھولا ڈلوا یا تھا، قصبہ بھر کی لڑکیاں دوشیزائیں اور نویلی بہنیں ہمارے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں۔ بڑا دل کش منظر ہوتا تھا، جب شاما پیگ بڑھاتی تو میرا دل بلبلوں اچھلنے لگتا اور جب وہ پیگ بڑھاتے

بڑھاتے دور اور چنار کی ٹہنیوں کے سبز سبز تپوں میں ایک لمحے کے لئے گم ہو جاتی تو میرا دل
اچک کر گلے میں آ رہتا، کہیں وہ گھر نہ پڑے۔

ایک دن جب شاما جھول جھول رہی تھی اور میرا نوکر رالی میسر پاؤں داب
رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا، رالی، اگر وہ گھر پڑے تو پھر کیا ہو؟
رالی بولا کون بابو جی؟

”شاما“

رالی بچا را حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا، اُسے میری بات سمجھ میں
نہ آتی۔ اُسے کیا پتہ تھا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔

رالی بچا را سیدھا سادھا نوکر ہے، کبھی کبھی ہلکا کر بات کرتا ہے۔ باپ کے ہوتے
ہوتے بھی یتیم ہے۔ کیونکہ اس کی سوتیلی ماں نے اُسے گھر سے نکال دیا ہے اور بٹھے بھائی
کے پیار اور ماں باپ کے لاڈ اور چاؤ نے عالم شباب ہی میں اُس کے بال کھڑی
کر دیئے ہیں۔

”رالی“ میں نے اُسے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا: ”تم میری بات نہیں سمجھتے“
”تو میں شاما کی ماں دھڑکتی ہوئی آئی کہنے لگی، بابو جی، ذرا رالی کو اجازت دینا، پن چکی سے
آٹا پساکر لے آئے، بڑی مہربانی ہوگی (آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر) آج ضرور بارش ہوگی
اور اگر رالی ابھی ابھی آٹا نہ لے آیا تو پھر ندی زوروں پر ہو جائے گی، دیکھئے بادل پہاڑوں
پر کیسے چھائے ہوئے ہیں۔“

رالی بولا۔ میں ابھی جانا ہوں۔“

میں نے کہا: میری طرف سے اجازت ہے۔“ رالی یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
 رالی بجا را بہت سیدھا سا دھماکا ہے، میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ چاروں طرف
 بادل چھا رہے تھے اور مشرق کی طرف تو کالا دھاری کی چوٹیاں کالی گھٹاؤں میں چھپی ہوئی
 تھیں۔ میں نے دل میں سوچا آج ندی میں خوب طغیانی آئے گی۔ پہاڑی نالہ کمزور آدمی کے
 غصے کی طرح ہے جلد چڑھتا ہے اور جلد ہی اتر جاتا ہے، ساون کے دنوں میں ندی کئی
 جانبیں لے لیتی ہے۔ نالہ ایک دم ٹھاٹھیں مارتا ہوا آتا ہے اور کناروں سے اچھل کر میلوں
 اطراف میں پھیل جاتا ہے گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، ڈھور ٹنڈنگرا اور مانج لو
 مال کے نقصان کا کچھ اندازہ نہیں۔

اماں میرے قریب آ کر کہنے لگیں۔ اندر چلو آج بارش ہوگی، گھٹاؤں کی کھڑکی ہے

رالی کہاں ہے؟

شام کی ماں نے پن چکی سے آٹا لانے کو کہا تھا، ادھر ہی گیا ہوگا، چلو اندر چلتا ہوں
 لڑکیوں کے جھولا جھولتے جھولتے بارش شروع ہو گئی۔ پل میں جل نخل ہو گیا، ندی کی پر
 روانی میری خوابگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات کے دس بج گئے۔ رالی نہ آیا۔ اماں اسی فکر میں کھٹی ہوئی میرے پاس بیٹھی ہیں
 ”بکثرت کو اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی، انکار کر دیتا۔“ اماں نے کہا۔
 ”میں نے ہی اجازت دیدی تھی۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تم بھی نادان ہو، وہ بھلا اس موسلا دھار بارش میں کیسے آئے گا، دراندی کا شور
 تو سنو، ندی ٹھاٹھیں مار رہی ہے اور وہ اس وقت تک کیوں نہیں آیا، پرن چکی بھی تو دور
 نہیں ہے یہی چار میل کے قریب ہوگی، اسے اس وقت تک آ جانا چاہئے تھا، کہیں اس
 پار ہی نہ رہ گیا ہو۔“

”اور اماں میں نے جھگڑتے ہوئے کہا: اگر اس نے ندی کو عبور کرنے کی کوشش کی
 ہو، یوں تو اچھا خاصا تیراک ...“

”سچپ بیٹا، یوں نہیں کہا کرتے، راج سب کا بھلا کرتے ہیں۔“
 بارہ بج گئے مگر مجھے غنیمت نہ آئی، شمع کی محقر تھراتی ہوئی لو میں نے دیکھا کہ اماں
 وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی ہیں اتنے میں آنگن میں آہٹ سی ہوئی، کسی نے دیوار کے ساتھ
 اپنا سونٹائیٹک دیا اور لمبی سانس لی۔

”میں نے کہا: رالی ہے۔“

”جی ہاں۔“

”آٹا لے آئے۔“

”دوے آیا بالو جی، وہاں اُن کے گھر تو سب سوئے پڑے تھے، ددھوا کو جگایا
 اور اس کے سوانے کر کے ابھی آ رہا ہوں۔“

”کبکھت میں پوچھتا ہوں تم آٹا کیسے لے آئے؟“

”کھال میں بالو جی، بالکل نہیں بھگنے دیا۔ ندی بڑے زوروں پر تھی، میسر نے ہی

جان سلامت رکھی۔“

”بیوقوف تمہیں آنے کی اتنی کیا جلدی تھی، ندی کے پار ہی رہ جاتے۔“

”میں نے سوچا شاہ ما بھوکے رہے گی۔۔۔۔۔“

جواب سن کر میں بھوکا رہ گیا، یہ بنگلے کے پورے میں اگور کے خوشے کیسے تلخ لہجے

میں نے اس سے پوچھا۔ اور اگر تم ندی میں غرق ہو جاتے تو۔۔۔۔۔“

رالی تھوڑی دیر چپ رہا پھر مہلانے لگا۔ میرا۔۔۔۔۔ راکیا ہے بالوجہ، یہ زندگی

ک۔۔۔۔۔ ک۔۔۔۔۔ کسی کے کام آجاتی، میں اپنے آپ کو بھاگوان سمجھتا۔“

”کبخت، مجنوں بھی کوئی تمہاری ہی طرح کا گنوار ہوگا۔“

”کیا کہا بالوجہ۔“

”کچھ نہیں جانا، سو رہا۔“

اب شمع زرد پڑ چکی تھی، زرد اور بالکل ساکن، صرف ایک پروانہ اس کے گرد گھوم

رہا تھا، میں غنودگی سے لبریز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پروانہ۔۔۔۔۔ شمع

۔۔۔۔۔ رالی۔۔۔۔۔ پروانہ۔۔۔۔۔ رالی۔۔۔۔۔ شمع۔۔۔۔۔ رالی۔۔۔۔۔

شاما۔۔۔۔۔ شمع۔۔۔۔۔

بادا تھن گر کا ”استھان“ ندی کے کنارے شمشان بھومی کے قریب واقع ہے۔

اس میں ایک چھوٹا سا مندر ہے اور ایک مختصر سا بانجھا اور اس کے ساتھ کپڑے دھونے

کاگھاٹ، باواجی اور اُن کا چیلہ سونٹا تھا وہیں دیوی کے تدمول میں آسن جماتے ہیں اور رات کو بھی وہیں پڑ کر سو رہتے ہیں۔ ندی میں ہر سال طغیانی آتی ہے مگر مندر ہمیشہ محفوظ رہا۔ ^{امن دیا گیا} مامون رہتا ہے۔ پچھلے سال تو گھاٹ بھی بہ گیا تھا مگر مندر جوں کا توں کھڑا رہا۔ سب باواجی کی دُعا کا اثر ہے اور اُن کے فوق الفطرت ہونے کا ثبوت۔ شام کی ماں دھوا باواجی کو ہر روز پرنام کرنے جاتی ہے اور شا مابھی کبھی کبھار اُس کے ساتھ جایا کرتی ہے۔ میں نے پہلے پہل اُسے باواجی کے باغیچے میں ہی دیکھا تھا۔ اُس نے جوہی کے پھولوں کا ایک گچھا اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا اور دوپٹے میں پھول چن چن کر رکھ رہی تھی آد جوہی کے پھول۔

کتنی مدت ہو گئی اُس ادیس ملاقات کو، مگر آج پھر وہ پہلی نگاہیں اور جوہی کے پھول مجھے وہ دہریا دے رہے تھے ہم کٹری کی سوتیوں کو الٹ پلٹ کر سکتے ہیں مگر زمانے کی سوتی کو اُٹا پھیر دینے کی کس میں تہمت ہے، کاش وہ پہلی نگاہیں مجھے واپس مل جائیں کاش میں انہیں پھر اک بار دیکھ لیتا، وہ نگاہیں جنہوں نے میرے سینے میں اُمنگوں کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ جنہوں نے محبت کی سوتی ہوئی ندی کو اپنے نازک پتو اردل سے منظرِ ظہم کر دیا تھا، مگر آج وہ حقیقت محض ایک خواب ہے، شفق کی طرح رنگین، قوسِ قزح کی طرح دُور۔۔۔۔۔

رالی میرے پاؤں داب رہا تھا، میں نے اُسے آہستہ سے کہا: رالی مندر سے جوہی کے پھول لاؤ گے؟

رالی بولے۔ بالو جی بارش ہو رہی ہے۔ پھر یہ کہہ کر خود ہی اٹھ کھڑا ہوا: اچھا جاتا ہوں۔
 رالی اُسی موسمِ لا دھار بارش میں اٹھ کر چلا گیا۔ آج اُس کی نگاہِ اولیں کی یاد نے
 دل کی دبی ہوئی انگلیوں میں ایک چیمبانی کیفیت سی پیدا کر دی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند
 کر لیں اور اپنی خیالی دُنیا میں گم ہو گیا، اس دُنیا کو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس
 خیال سے مجھے ایک گونڈ تسلی ہوتی ہے کہ یہ دُنیا میری ہے اور اس جسدِ خاکی کے آخری
 سانس، زندگی کے آخری لمحے اور دل کی آخری دھڑکن تک یہ دُنیا میری ہوگی، شاید
 اب یہ دُنیا ہی میرا سرِ پایہ حیات ہے۔ اس دُنیا میں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک
 ناؤ بن گیا ہوں، ایک ناؤ جو چاروں طرف لہروں سے گھری ہوئی ہے۔ لہریں کھیلتی
 ہیں، ہسکراتی ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی انخوائی کندوں کو ہلکے ہلکے پیار کرتی ہیں،
 یکایک میں اپنے باؤبان پھیل دیتا ہوں، اور لہریں اپنے شانوں پر لٹے ہوئے مجھے دُور دُور
 بہا لے جاتی ہیں، پتہ نہیں کس طرف؟ جگہ نہ کیوں؟ مجھے صرف اک خاموش وقتی
 اور اک جانفزا سرور کا احساس ہوتا ہے، کیفیت اور اور شیریں۔ کیف - نشہ

پتہ نہیں میں کتنا عرصہ اسی خیالی دُنیا میں گم رہا یا کتنا عرصہ اور اسی خیالی دُنیا میں گم رہتا
 اگر اماں میراث نہ چھینچھو کر جگہ نہ تئیں۔ بیٹا، اٹھو تو سہی، وہ دیکھو رالی...
 میں نے آہستہ سے کہا: کیا بات ہے۔ ماں، رالی پھول لے آیا ہے
 ”اچھا تو کیا تم نے اُسے منہ نہ بھیج دیا تھا؟“ اماں نے کہا: ”آہ بچار رالی، اس کا باز
 ٹوٹ گیا ہے اور اُس کے سر پر کئی سو پلٹیں آئی ہیں، براہِ رے میں پڑا ہے۔“

میں جلدی سے اُٹھ کر برآمدے میں گیا۔ رالی آنکھیں بند کئے چارپائی پر پڑا آہستہ آہستہ
 کراہ رہا تھا۔ سر پر اور دانتیں بازو پر پٹیاں بندھی تھیں، میں نے پوچھا۔ "بیوقوف، کیا مندر
 میں باواجی سے لڑ پڑے، اگر وہ پھول نہ دیتے تھے تو واپس چلے آتے، جھگڑا کرنے کی کیا
 ضرورت تھی، سو مناتھ نے بھی بیٹا ہو گا تمہیں، جیسا کہ رو دیا چلیا۔"

"وہ مندر کہاں رہا بیٹا، یہ جو تین دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی، اس کمبخت جھڑی کو کچھ لیکر
 ہی ملتا تھا، آج ندی میں اس ندر طغیانی ہے کہ تو بہہ ہی چلی، ذرا شور تو سُنو، اور جب رالی مندر کی
 طرف پھول لینے گیا تو مندر کے چاروں طرف پانی چڑھ رہا تھا اور گھاٹ بہ رہا تھا۔"
 "تو میں نے تو اُسے یوں ہی بھیج دیا تھا اگر پانی چڑھ رہا تھا تو نہ جاتا، اسی
 بھی میں نے فقرہ ناتمام چھوڑ دیا۔"

"کیسے نہ جاتا بیٹا، وہاں شاما"
 "کیا کہا، شاما؟"

اماں میری بات ان سنی کر کے بولیں۔ "اور دیکھو یہ باد اور اس کا چیلہ — دونوں
 کتنے کینے نکلے، ان کو اتنا بھی نہ خیال آیا کہ
 "مگر شاما کیا؟" میں نے قطع کلام کہتے ہوئے کہا۔

"کہہ تو رہی ہوں بیٹا۔" اماں جلدی سے بولیں۔ "کہ شاما بھی وہاں گئی ہوئی تھی اور دیوی
 جی کو پر نام کر کے بانچہ میں جوہی کے پھول چُن رہی تھی کہ بارش نے اگھیرا، وہیں مندر میں ٹھہر
 گئی، سوچا ہو گا کہ بارش تھے تو جاؤں، آن کی آن میں جل تھل ہو گیا، مندر کے چاروں

طرف پانی لہریں مارنے لگا اور جب نیا گھاٹ بھی بہنے لگا اور ندی کا رُخ مندر کی طرف مڑا۔
 تو بادا جی بڑے گھبرائے پھیلے سمیت بھاگ کھڑے ہوئے۔

”اور شاما کو وہیں چھوڑ دیا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا

”کچھ نہ پوچھو، جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے، مجب رالی وہاں پہنچا تو پانی نے مندر
 کو چاروں طرف اچھی طرح سے گھیر لیا تھا۔ شاما بیٹھیں پر کھڑی جھینس مار رہی تھی اور بادا
 اور ان کا چپ لائیرتے ہوئے خشکی کی طرف آ رہے تھے۔“

”کیئے؟“ میں نے تیز تر لہجے میں کہا

”اتنے میں کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، اماں اندر چلی گئیں، نائب تحصیلدار صاحب تھے
 برآمدے میں آکر رالی کے سرہانے بیٹھ گئے کہنے لگے: آپ کے نوکر نے آج بڑی جو اندری دکھائی
 مندر کی گرتی ہوئی دیواروں اور ٹھانٹھیں مارتے ہوئے پانی کے ریلوں سے شاما کو بچا کر لے
 آیا، پوچھیں تو بہت لگی ہیں بچاے کو، میں نے ڈاکٹر سے وہیں پٹی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا
 آج شام کو ڈاکٹر چھڑ گیا۔۔۔۔۔ رالی بیٹا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔“

”اُن کا کہہ کر تحصیلدار صاحب چپ ہو گئے اور رالی کی طرف دیکھنے لگے۔ رالی خاموش
 لیٹا ہوا تھا، میں نے اس کی نبض دیکھی تو وہ چھوٹ چھوٹ کر رونے لگا۔

”کیوں روتے ہو رالی؟“ میں نے پوچھا

”رالی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔“ بابو جی سر میں بہت درد ہے۔“

”تحصیلدار صاحب چارپائی سے اٹھ کر لمبے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں اور ڈاکٹر کو ابھی

آپ کے ہاں بھجنا ہوں چو نہیں تو معمولی ہیں، میرے خیال میں، ایک دو دن ہیں اچھا ہو جائیگا۔ فکر نہ کریں۔ شاہ کا خاوند سنا ہے۔ کل یہاں پہنچے گا۔“

وہ چلے گئے، میں چپ چاپ رالی کے پاس بیٹھا رہا۔ شاہ کا خاوند کل یہاں پہنچے گا۔ کل فکر نہ کریں چو نہیں معمولی ہیں چوٹ کاش تختہ بیدار صاحب کو بچتا ہو تاکہ یہ چو نہیں معمولی نہیں ہوا کرتیں“

اماں رالی کے لئے گرم دودھ لے آئیں، میں چچہ سے اُسے پلانے لگا۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

اس واقعے کے پانچ روز بعد شاہ اپنے خاوند کے ہمراہ چکوال چلی گئی۔ جانے سے قبل وہ مجھے ملنے کے لئے آئی۔

”میں آج جا رہی ہوں بھیا۔“

اس کا بھرہ زرد تھا، اور لب انار کی کٹی کی طرح سُرخ تھے۔

میں نے خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھا اور چپ ہو رہا، ماں نے ہاتھ پھیلا کر اسے دعا دی۔ ”پریشہر تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رکھے۔“

”رالی کہہ رہے بھیا، میں اُسے ملے بغیر نہ جاؤں گی۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”رالی چشمنے سے پانی بھرنے گیا ہے، اب آتا ہی ہو گا۔“

گھنٹہ پون گھنٹہ گزر گیا، مگر رالی نہ آیا۔

میں نے نہایت نرم لہجے میں آہستہ سے کہا: "شاید وہ نہ بیگناشا!"
جیسے اُس نے میری بات سمجھ لی ہو، وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی، آہستہ سے بولی: "میں اچھے
ہو جاؤ گے بھیا۔" پھر اُس نے سر جھکا کر ماں کو پر نام کیا۔

اور وہ چلی گئی۔ چپ چاپ خاموش سر جھکائے ہوئے مجرم کی طرح۔
کائنات کا ہر ذرہ بے مہر ہے، اور انسان کی ہر کو شمش بے سود، یہ انسان کتنا
حقیر ہے، اور یہ دنیا اس سے بھی حقیر، یہ عقدہ لانیل کیا ہے؟ اور کس لئے؟ اور پھر
اگر تمام زندگی کو یوں مٹھی میں بند کر کے چُر مر کر دیا جائے، اس طرح کس کے رہنے رہے
ہو کر پھر جائیں، اور کوئی ان کی پُرانگ بھی نہ پاسکے تو پھر... تو پھر کیا ہو...
کس لئے یہ... کیونکر یہ؟

دل میں ہزاروں خیال تھے۔

بے سود، سب بے سود،

بہت دیر کے بعد رالی آیا، پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے ہوئے، اُس کا چہرہ اتنا ہوا
تھا اور ہنٹ نیلے، تھوڑی دیر پھر کر جب وہ میرے پاؤں دابنے بیٹھا تو میں نے اُس
سے پوچھا۔ رالی آج کہاں غائب رہا۔

"ہاں مجھے دیر ہو گئی، بابو جی معاف کر دو۔" اس نے جواب میں کہا
کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے، پھر رالی بولا: "اس دن آپ نے جو ہی کے پھول
مانگے تھے، آپ یگچھا لے سکتے ہیں، یہ کہہ کر اُس نے حجب سے پھولوں کا ایک گچھا

نکالا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ باسی بھڑبول تھے اور پتیاں زرد، مگر ان میں خوشبو تھی۔
مجھے تحصیلدار صاحب کی بات یاد آگئی، میں نے کہا: "رالی، اسے تم رکھ لو۔ یہ لو
اسے تمہیں اپنے پاس رکھو۔"

"نہیں بالو جی میں اسے نہیں لے سکتا۔"
"کیوں؟"

رالی چپ ہو رہا۔

میں نے ایک پھکی ہنسی سنتے ہوئے کہا: "رالی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے جذباتی
اور شاعر مزاج ہو۔"

رالی چپ بیٹھا رہا، بے جان، بے حس و حرکت، ہنسی کی صورت پھر سر جھکا کر آہستہ
سے میرے پاؤں دابنے لگا، اگر مآنسوؤں کے ایک دو قطرے میرے پاؤں پر گر پڑے۔
زندگی کس قدر عجیب ہے!

شاما دودھوا باواجی رالی سوسنا تھ
. ریشم کے کیڑے
زندگی کس قدر عجیب ہے *

(محمد اقبال عباسی خوش نویس لاہور)

al
da
da
da
s
la
e

t
or
7

1. Political Science Theory by Kaeley - Kusum Wadia
2. Modern govt. of Europe, B.M. Shum - Sahib
3. World Constitutions Kaeley - Kusum Wadia
4. Constitutional history, Adams
5. Milton
6. Parliamentary form of govt. } Bhatecharya
7. Principles of criticism. } Sardar. Kallari

گرشن چندر

اُردو کا محبوب، منفرد، مجتہد اور مسلمہ فن کار

روشنائی کی بجائے اپنے خون سے لکھنے کا عادی ہے۔
وہ طلائی جھنکاروں کی دودادیں بیان نہیں کرتا بلکہ ان
جھنکاروں میں دبی ہوئی بھوکوں کے تجڑے کرتا ہے۔ دھرتی
پر جہاں کہیں ظلم کا پرچم بلند ہوتا ہے کرشن چندر اس
کے خلاف مظلوم انسانیت کے احتجاج کی ترجمانی کرتا ہے۔
جہاں کہیں آزادی اور انصاف کی جنگ لڑی جاتی ہے۔
کرشن چندر کا قلم اس کی حمایت کرتا ہے۔

گرشن چندر

کسی ایک قوم، ایک فرقے یا ایک نسل کا ادیب نہیں
وہ ساری انسانیت کا ادیب ہے

آن داتا تین غنڈے طلسم خیال

زندگی کے موڑ پر ٹوٹے ہوئے تارے

کرشن چندر کے مقبول ترین مجموعے